میرا قبلہ تے کعبہ

(بھائی کی یاد میں)

حصّہ اوّل

منزّہ سلیم

میرا قبلہ تے کعبہ

(بھائی کی یاد میں)

منزّہ سلیم

مثال

تعارف

ڈاکٹر مقبول اختر، 13 نومبر 1938ء کو لاہور میں پیدا ہوئے۔ انھوں نے ایف۔ ایس۔ سی، گورنمنٹ کالج لاہور سے اور پھر 1962ء میں نشتر میڈیکل کالج ملتان سے ایم۔ بی۔ بی۔ ایس کیا۔ کچھ عرصہ اپنے ننھیال (میجر اسحاق محمد) کے گاؤں اور پھر لائل پور میں پریکٹس کرنے کے بعد 1964ء میں مسقط چلے گئے۔ 1966ء میں واپس آ کر دوبارہ لائل پور میں پریکٹس شروع کر دی۔ 1986ء میں M.C.P.S سائیکیٹری کا امتحان پاس کرنے کے بعد سوشل سکیورٹی ہسپتال فیصل آباد میں بطور ماہرِ نفسیات تعینات ہو گئے اور شام میں ستیانہ روڈ پر پرائیوٹ پریکٹس کرنے لگے۔

18 جنوری 2010ء کو اُن پر فالج کا حملہ ہوا، اور 10 اگست 2010ء کو داعیِ اجل کو لبیک کہا اور اپنے خالقِ حقیقی سے جا ملے اور اپنے آبائی قبرستان، شیر سنگھ والا فیصل آباد میں اپنی والدہ محترمہ کے قدموں اور اپنی اہلیہ کے پہلو میں ابدی نیند جا سوئے۔

”جس طرح رونا چاہیے اس طرح تو مجھے
آتا ہی نہیں بس یونہی بیٹھی ہوئی ہوں
آنسوؤں سے تر ہاتھ سر پر رکھ کر“

(شاہ عبداللطیف بھٹائی رحمۃ اللہ علیہ)

میرا قبلہ تے کعبہ

(ڈاکٹر بھائی کی یاد میں)

فرخ منظور صاحب کیلئے

منزّہ سلیم

اگست ۲۰۱۶

منزّہ سلیم

میرا قبلہ تے کعبہ

(ڈاکٹر بھائی کی یاد میں)

منزّہ سلیم

مثال پبلشرز
رحیم سینٹر، پریس مارکیٹ، امین پور بازار، فیصل آباد

طلوعِ اوّل 2011

کتاب میرا قبلہ تے کعبہ

مصنفہ منزّہ سلیم

ہاؤس نمبر 76، سٹریٹ نمبر 2، شادمان ٹاؤن،
سرگودھا روڈ، فیصل آباد، فون: 041-8789494

ناشر محمد عابد

ٹائٹل کی تصاویر عاصم براد۔ احمد عزیز

مطبع شرکت پریس، لاہور

تعداد 200

اہتمام مثال پبلشرز رحیم سینٹر پریس مارکیٹ امین پور بازار، فیصل آباد
Ph:2615359 -2643841 Mob:0300-6668284
E-mail:misaalpb@gmail.com

سُچجّی، سُنلّھی تے مِٹھّڑی

کریم بی بی

دے ناں

جہدے پیراں تھلّے میری جنت سی

تے جہنے مینوں

اوڈے ای سُچجے، سگّھے تے مِٹھّڑے ویرے دِتّے

فہرست

ع نالے اساں ونڈ لئے نے ہنجواں دے ٹک ٹک

ڈاکٹر مقبول اختر کے احباب کے مضامین

تلسی داس نوں کسے پچھیا!

''ایڈے وڈّے عالم، فاضل ہو کے تساں سنسکرت چھڈ کے ہندی نوں کیوں اپنایا اے؟

تلسی داس نے پرتا وِدتّا!

''سنسکرت اک اجیہا سونے دا منقش پیالہ ہے جہدے وچ زہر بھری ہوئی ہے۔ پر میری ماں بولی 'ہندی' اک اجیہا مٹّی دا پیالہ ہے جس وچ امرت بھریا ہویا ہے۔''

میں تلسی داس تے نہیں بن سکدی پر اپنی ماں بولی نال پیار تے کر سکدی آں ناں؟ ساری عمر اردو وچ پڑھیا تے لکھیا اے۔۔۔ایدھی اپنی مٹھت اے۔اے کتاب وی اردو وچ ای لکھی اے پر ایدھے وچ میں، سرناویں پنجابی وچ لکھ کے پنجابی زبان نوں "I Love U" آکھیا اے۔

ооо

پچھا نہہ مڑ کے کی لبھدے او؟

Nostalgia سے مراد ماضی کی للک ہے، عام طور پر مثالی، معیاری، کامل اور اعلیٰ ترین انداز میں۔ یہ یونانی زبان کے دو الفاظ سے مل کر بنا ہے۔ N'otos جس سے مراد 'گھر کو واپسی' ہے اور A'lgos جس کا مطلب 'درد یا دکھ' ہے۔۔۔ یعنی ماضی کی یادوں میں کھو کر دکھی ہو جانا۔ اس کی وضاحت یوں کی جاسکتی ہے کہ ماضی کے ادوار، اس کی شخصیات، واقعات اور خاص طور پر "Good old days" کو یاد کرنا۔ انہیں اپنے لیے مینارِ نور بناتے ہوئے۔ کبھی اچانک سے کسی واقعہ کا 'باتصویر' سامنے آجانا یا بچپن سے کچھ اخذ کرنا۔۔۔ ستائشی محسوسات کے ساتھ۔

جناب مشتاق احمد یوسفی اپنی کتاب 'آبِ گم' کے دیباچہ 'تصنیف را مصنف' میں ناسٹل جیا کی وضاحت کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔

''جب انسان کو ماضی حال سے زیادہ پرکشش نظر آنے لگے اور مستقبل نظر آنا ہی بند ہو جائے تو باور کرنا چاہیے کہ وہ بوڑھا ہو گیا ہے۔ یاد رہے کہ بڑھاپے کا 'جوانی' لیوا حملہ کسی بھی عمر میں۔۔۔ بالخصوص بھری جوانی میں۔۔۔ ہو سکتا ہے۔۔۔ غور سے دیکھا جائے تو

ایشیائی ڈرامے کا وِلن ماضی ہے۔ پاستان طرازی کے پس منظر میں مجروح انا کا طاؤسی رقص دیدنی ہوتا ہے کہ مور فقط اپنا ناچ ہی نہیں، اپنا جنگل بھی خود پیدا کرتا ہے۔ ناچتے ناچتے ایک طلسماتی لمحہ ایسا آتا ہے کہ سارا جنگل ناچنے لگتا ہے اور مور خاموش کھڑا دیکھتا رہ جاتا ہے۔ ناسٹل جیا اسی لمحۂ منجمد کی داستان ہے۔''

میں بھی نشۂ ماضی میں سرمست، ناسٹل جیا کی ایک مریضہ ہوں۔

میں نے اپنی بھری جوانی، یعنی تیس برس کی عمر میں، تین سال کے عرصہ کے دوران والدین اور دو جوان بھائیوں کا صدمہ دیکھا۔ دیکھتے ہی دیکھتے میرا حال میرے ماضی میں تبدیل ہو گیا تو میں اس 'جوانی' لیوا مرض میں مبتلا ہو گئی اور Unfinished Bereveament کی وجہ سے آج تک صحت یاب نہ ہو پائی۔

زندگی دکھ اور سکھ کا مونتاژ ہے۔ دھوپ اور سائے۔۔۔ ماضی بن جانے والا میرا حال مجھے سونے نہیں دیتا، لیکن میں صحت یاب ہونا نہیں چاہتی کیونکہ میرے ماضی کی یادیں، وہ ریت ہیں جن میں مَیں اپنے حال کے طوفانوں کو دیکھ کر منہ چھپا لیتی ہوں اور میرے ماضی کی روشن یادوں کے ہنڈولے مجھے بھٹکنے نہیں دیتے۔

میں نے اپنے میکے کی یادوں کی خوشبو میں بسی پہلی کتاب 'پھول لاکھوں برس نہیں رہتے' میں 'پیار کا ساون' کے عنوان سے لکھا ہے۔

'ناسٹل جیا۔۔۔ ناسٹل جیا کیوں؟ ماضی میں جینا کس لیے؟ جانتی ہوں کہ منہ پھیر کر دیکھتے رہنے کو آپ پسند نہ کریں گے، لیکن اگر ماضی میں

'پیار کا ساون ہو
محبتوں کی برسات ہو
قہقہوں کے جھولے ہوں
اور سب ساتھ ہوں'

تو کیا اس سے منہ پھیرا جا سکتا ہے؟ زندگی میں اور کس چیز کی ضرورت ہے؟

بے انتہا شکر کہ خدا نے میرے حال کو رشتوں کی محبتوں سے مالا مال کر رکھا ہے۔۔۔
بہت کچھ ہے، بے بہا، بے شمار، بے پناہ۔۔۔ سب سے بڑھ کر میری نواسیاں۔۔۔ 'مایۂ خویش'
لیکن انسانی رشتوں کی یہ خاصیت ہے کہ ایک رشتے کی جگہ، دوسرا رشتہ نہیں لے سکتا۔۔۔
ورنہ کوئی روئے کیوں؟ اور پھر رونے میں شرمندگی کیسی؟

ایک ہی والدین کے بچے، آپس میں بہن بھائی ہی ہوتے ہیں لیکن میں دعوے سے کہہ سکتی ہوں کہ جیسے بہن بھائی ہم تھے، دنیا میں کم ہی ہوں گے۔

یہ کتاب میں نے اپنے منجھلے اور آخری حیات بھائی 'ڈاکٹر مقبول اختر' کی یاد میں لکھی ہے۔۔ وہ میرے لیے باپ، بھائی، دوست، معالج، صلاح کار اور بہترین ساتھی تھے۔ جن کے سہارے میں اپنی زندگی کے دکھوں، پریشانیوں اور محرومیوں کو برداشت کرتی رہی۔

جن کے رخصت ہو جانے سے صرف ایک گھنٹہ قبل میں نے ان کے سینے پر سر رکھا تو انہوں نے میرے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے لڑکھڑاتی ہوئی زبان میں مجھے نصیحت (یا وصیت) کی کہ

''ہنستی رہنا، کتاب مکمل کرنا اور سب کا خیال رکھنا''

میں نے مسکراتے چہرے اور روتے دل کے ساتھ، ان کے سینے سے سر اُٹھایا اور ان کی بات کا جواب، اشاروں کی زبان میں دیتے ہوئے، ان کی فکر مندی کو وقتی طور پر دور کرنے کی ناکام کوشش کی (برین ہیمرج کی وجہ سے ان کی قوتِ سماعت مکمل طور پر جاتی رہی تھی)

ان کے جدا ہو جانے کے بعد میں نے سوچا کہ کیا میں یہ سب کر پاؤں گی؟ ان کی محبت، رہنمائی اور سہارے کے بغیر۔۔۔ یہ ایک بہت بڑا سوالیہ نشان تھا، جس کا فیصلہ مستقبل کو کرنا تھا، ہر اس کام کی طرح جو ناممکن نظر آتا ہو۔۔۔ اور اس کا جواب یہ تھا کہ مجھے

یہ سب کرنا ہوگا۔۔۔ اس ساٹھ سالہ 'بچّی' کو۔۔۔ وہ 'بچّی' جو ان کے رخصت ہوتے ہی، یکلدم ایک نحیف، تنہا اور عمر رسیدہ بڑھیا میں تبدیل ہو گئی تھی۔۔۔ لمحاتی کرشمہ۔۔۔

ان کے جانے کے چار ماہ بعد میں نے اپنی دوسری کتاب 'ادھوری عورت' جو کہ ایک ناول ہے، مکمل کر لی۔ کیسے کی؟ مجھے خود پر حیرت ہے کہ شدید صدمے کی حالت میں یہ کیونکر ممکن ہوا؟ بس وہی جذبہ، جس کے تحت 'پیر و مرشد' کے کہنے پر جان وارنے سے بھی گریز نہیں کیا جاتا۔

سب کا خیال رکھنے کی بات آتی ہے تو میں اپنی سی کوشش تو کر سکتی ہوں۔۔۔ ان کے لیے جو اس بات پر راضی ہوں۔۔۔ لیکن بھائی جیسا حوصلہ مجھ میں کہاں؟

اور ہنستے رہنے والی نصیحت کا احوال یہ ہے کہ ایک طرف تو مجھے ہنستے رہنے کو کہا اور جاتے جاتے مجھ سے 'Hand' کر گئے۔ چپکے سے میری ہنسی اپنے ساتھ لے گئے۔ جو ابھی تک تو واپس نہیں آئی، آئندہ کے لیے کیا کہوں؟

ان سے میرا تعلق ایسا تھا جس میں خاموشی بھی زبان بن جاتی ہے۔۔۔ بنا کچھ کہے۔۔۔ بنا کچھ سنے، ہم ایک دوسرے کو سمجھ سکتے ہیں۔ لیکن اب کوئی ہم سخن، کوئی ہم زبان مجھے میسر نہ آ سکے گا۔ ان کا جانا نوشتۂ دیوار ہے لیکن اسے پڑھنے کا حوصلہ کہاں سے لاؤں؟

؎ تمہی کیوں اُٹھ کے چل دیے
کہ دیدنی تھا دِن ابھی
اور دیدنی تھی شام بھی

ماضی انمول ہے اور واپسی کا سفر ناممکن۔۔۔

ہم دونوں میں صرف یادوں اور دُکھوں کی سانجھ ہی نہیں تھی، ہم بہت مزے مزے کی باتیں بھی کیا کرتے تھے۔ لطیفہ گوئی، سیاست، انسان دوستی، ادب، شاعری، موسیقی۔۔۔ وہ علم کا خزینہ تھے۔ وہ کیا تھے؟ میرے احساسات کو الفاظ میں مقید کرنا ناممکن ہے۔

ع مر گئے ہم تو یہ کتبے پہ لکھا جائے گا
سو گئے آپ زمانے کو جگانے والے

اور اب میں لکھوں تو کیونکر کہ وہ شخص، میرے ماضی کا حصہ بن چکا ہے، جو جانے کے بعد بھی میرے سامنے، میرے قریب ہے۔ جس کی محبت، اس محبت کی ساری شدت اور اس محبت کی چاشنی، پاکیزگی اور بلند قامتی میری محدود سی دنیا کا سرمایہ ہے یا جس کی غیر موجودگی کو ابھی تک دل نے تسلیم نہ کیا ہو، جس کے 'ہونے' کا یقین محکم اب بھی ہمراہ ہو۔۔۔ پورے جہاں معنی کے ساتھ۔ کیسے لکھوں کہ وہ سدا کے لیے میرا ساتھ چھوڑ گیا۔ جب سجدے جبیں پر مچل رہے ہوں اور قبلہ نظر نہ آئے تو اس کیفیت کو کیسے بیان کروں۔ جب بچہ میلے کی بھیڑ میں کھو جائے تو اسے ارد گرد کی رنگینیاں نظر نہیں آتیں۔ اس کے سامنے صرف ایک لگن ہوتی ہے۔۔۔ کھوئے ہوؤں کو پا لینے کی لگن۔۔۔ میرے نزدیک یہی ناسٹل جیا ہے۔

منزّہ سلیم

ooo

گوٹے رنگے دِن

سنہرے دور کی اصطلاح یونانی دیو مالا سے آئی ہے۔ یہ انسانی زندگی کے چار پانچ مراحل میں پہلے درجے پر آتی ہے۔ اس کے بعد روپہلی، کانسی، فولادی اور پھر حال۔۔۔ وہ بھی جو زوال کی سمت رواں ہے۔

سنہرا دَور، وہ دَور ہے جس میں امن، توازن، استحکام اور خوشحالی ہے۔ ہندو دیو مالا میں بھی اسی طرح درجہ وار یوگ یعنی ادوار دِکھائی دیتے ہیں۔ ایسے ہی مشرقِ وسطیٰ اور قدیم دُنیا میں بھی۔

سنہری کے بعد، روپہلا جو سنہری کی نسبت کم لیکن قدرے بہتر دور ہے۔ کانسی اور فولادی دور وہ ہے جہاں انسان کو دُنیا کی سختی، لالچ اور بداخلاقی کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔

ڈاکٹر مقبول اختر۔۔۔ میرے آخری حیات بھائی۔۔۔ میرے سنہری دَور کی نشانی تھے۔ زندگی کی تمازتوں میں ان کا پیار، چھاؤں سا تھا۔ زمانے کی کڑی دھوپ نے بہتیرا اثر پایا لیکن میرے میکے کے گھنے نخلستان کا آخری چھتنار پیڑ ابھی باقی تھا جس کی خنک ٹھنڈک میں ستا لیتی تو پھر آگے بڑھنے کے قابل ہو جاتی۔

ع غم کی حدت میں ان کا طرزِ تپاک
سرد جھونکوں، گھنی گھٹاؤں سا 'تھا'

کھیڈن دے دن چار

بچپن میں میرے پاس ایک کتاب تھی 'پچاس چیزیں جو ایک لڑکی بنا سکتی ہے' اس میں چھوٹی چھوٹی چیزیں مثلاً کارڈ، Origami, Stuffed Toys اور کچھ کھانے پینے کی چیزیں، جیسے مشروبات اور سینڈوچ وغیرہ بنانے کی تراکیب شامل تھیں۔ اس میں چاکلیٹ بنانے کا طریقہ بھی درج تھا۔ ڈاکٹر بھائی چھٹیوں میں گھر آتے تو میں اور وہ مل کر چاکلیٹ بناتے جو مجھے اور ڈاکٹر بھائی دونوں کو بہت پسند تھے۔ آپا جی نہ تو کھاتیں اور نہ کچھ کہتیں۔ چھوٹے بھائی کہتے۔

''آپ لوگ تو فیشن کے طور پر کھاتے ہیں۔ ورنہ ہے کیا یہ؟ Brooklax''
(اس زمانے میں قبض کے لیے ایک دوا ہوتی تھی)

بڑے بھائی جان ہمیں چاکلیٹ کھاتے دیکھ کر کہتے،

''توں وی پاگل ایں تے اووی''

میں اور ڈاکٹر بھائی، بہت ہلکی آنچ پر مکھن کو پگھلاتے۔ اس میں پسی ہوئی چینی اور Cadbury's کا وہ Drinking Chocolate ملاتے جو بھائی دودھ میں ملا کر پیتے تھے پھر اسے خوب پھینٹتے، جب وہ پھول جاتا تو اسے پلیٹ میں جما کر ٹکڑیاں کاٹ لیتے اور

مزے لے لے کر کھاتے۔ میرے بچپن میں چاکلیٹ عام طور پر ملتے ہی نہیں تھے اور اگر تھے بھی تو پہنچ سے باہر۔

جب ڈاکٹر بھائی مسقط گئے تو کسی آنے جانے والے کے ہاتھ، بہت عمدہ قسم کے چاکلیٹ بھیجتے۔ Cadbury اور Black Magic کی ٹرے۔۔۔ میرے مزے ہو جاتے کیونکہ اور کوئی تو کھاتا نہیں تھا۔

بھائی کے رخصت ہونے تک، ہمارے آپس کے تعلقات ایسے ہی تھے۔ جیسا کہ Charlette Gray کہتا ہے۔

"Me and my Sister may look old and wise to the out side world, but to each other, we are still in junior high."

میرے تینوں بھائیوں کا دوستانہ انداز میرے دل و روح کے لیے ایک دلنشیں تحفے کی مانند تھا۔۔۔ جیسے سنہری ریشم کی ڈور۔۔۔

ooo

ے میری پچھی دے وچوں پونی مکّی
میری چکّی چوں مک گیا گالا (شاہ حسین)

میرے ایف۔ایس۔سی کے پیپر ہو رہے تھے۔آخری پیپر سے ایک روز پہلے میں شدید بخار میں مبتلا ہوگئی۔بخار کی شدت، چکر اور قے نے میری حالت خراب کردی۔مجھے نہیں لگتا تھا کہ میں پرچہ حل کر پاؤں گی لیکن بھائی جان نے حوصلہ دلایا اور خود ساتھ گئے اور گورنمنٹ کالج برائے خواتین کارخانہ بازار کے گیٹ کے پاس بوڑھے برگد کے نیچے چپس کے بنے ہوئے چوکیدار کے بنچ پر، شدید گرمی میں تین گھنٹے بیٹھے رہے، اپنے میڈیکل بیگ کے ساتھ اور میں صرف اس سہارے پر کہ بھائی باہر موجود ہیں جیسے تیسے پرچہ حل کر پائی۔

لیکن۔۔۔آج زندگی کے کڑے امتحان میں میرا ساتھ چھوڑ دیا۔۔۔کیوں؟
میں کدھر دیکھوں؟

ع 'وِیر' میرا مینوں دِسدا ناہیں تے میں اوہلے بہہ بہہ روواں

ooo

پیار یا سانوں مٹھڑا نہ لگدا شور (بلّھے شاہ)

ہم پانچ بہن بھائی تھے۔دو بہنیں اور تین بھائی، امی، ابا جی نے ہماری پرورش اس طرح سے کی کہ بیٹے اور بیٹیوں میں کوئی فرق نہیں سمجھا۔نہ تعلیم دلاتے وقت، نہ برتاؤ میں، نہ اعتماد میں اور نہ ہی مصروفیات میں۔ہم پانچوں بہن بھائی کو ایجوکیشن میں پڑھے۔ ہم لوگ اکٹھے بیٹھتے، گپ شپ لگاتے، کتابیں پڑھتے اور بے تکلفی سے گھر میں آئے ہوئے مہمانوں سے ملتے۔میں تو سکول کے زمانے میں سائیکل اور سکوٹر اور بعد میں کار چلاتی رہی۔اس لیے مجھے اپنا لڑکی ہونا کبھی مصیبت نہیں لگا۔جیسے کہ عام طور پر لڑکیاں خواہش کرتی ہیں کہ کاش ہم لڑکا ہوتیں۔وجہ وہ تخصیص ہے جو ان کے گھر والے روا رکھتے ہیں۔

موسیقی کا شوق ہم سبھی کو تھا۔بڑے بھائی جان تو وائلن اور بانسری بجاتے اور ڈاکٹر بھائی ماؤتھ آرگن۔میں اور چھوٹے بھائی صرف ریڈیو سننے پر اکتفا کرتے۔جب ڈاکٹر بھائی مسقط گئے تو وہاں سے بہت اچھا Grundig کمپنی کا ریڈیو گرام لے کر آئے۔ میں اور بڑے بھائی اس پر غزلوں کے ریکارڈ بجاتے اختری بائی، کے ایل سہگل، مکیش، اقبال بانو اور ایسے ہی بڑے گانے والے۔

مجھے اور ڈاکٹر بھائی کو انگلش موسیقی سے بھی لگاؤ تھا۔ سمفنی، جاز۔۔۔ ایلوس پریسلے، ارل گرانٹ، نینا فریڈرک اور فرینک سناٹرا کے ریکارڈ بجاتے اور بجاتے چلے جاتے۔ LP ختم ہوتا تو میں ریڈیو گرام کی سوئی اُٹھا کر پھر سے شروع پر رکھ دیتی اور ساتھ ساتھ پڑھتی رہتی۔

کبھی کبھار میرے ابا جی کہتے کہ یہ کیسی پڑھائی ہے کہ ساتھ ساتھ میوزک چل رہا ہے لیکن میرے رزلٹ سے چونکہ وہ ہمیشہ مطمئن رہے اس لیے منع نہ کرتے۔

ڈاکٹر بھائی کی وفات کے بعد، میں اپنی نواسیوں سے بھائی کے بارے میں باتیں کر رہی تھی تو انگلش گانوں کا سن کر انہیں بھی تجسّس ہوا (وہ دونوں بھی انگلش موسیقی کی رسیا ہیں اور Justin Bieber, Selena Gomez, Miley Cyrus اور Lady Gaga کے گانے سنتی ہیں۔) انھوں نے میرے بتائے ہوئے گانے انٹرنیٹ پر تلاش کر کے سنے اور بہت Enjoy کیے لیکن مجھے تو ان میں سے دبی دبی آہوں اور سسکیوں کی آوازیں سنائی دیتی رہیں۔

ع تم کیا گئے کہ رُوٹھ گئے دن بہار کے

ooo

نج جنیندیئے بھولیئے مائے (شاہ حسین)

بھائی جان کے بال بالکل سیدھے تھے۔ ان میں کوئی خم نہیں تھا۔ وہ جب ماتھے پر جھک آتے تو بھائی انھیں ہاتھ سے پیچھے ہٹاتے۔ یہ بے اختیار انداز تھا، بغیر کسی بناوٹ کے، لیکن اِتنا اچھا لگتا کہ۔۔۔ جب کبھی وہ امّی کے پاس بیٹھے ہوتے اور بال ماتھے پر آ جاتے تو امّی اپنے ہاتھ سے بال پرے کرتیں اور بہت پیار بھرے لہجے میں کہتیں:

"اے بڑے نافرمان بال نیں"

ooo

چھیتی بوڑھیں وے طبیبا

میرے میکے گھر میں، روزانہ رات کے کھانے کے بعد اور چھٹی کے روز ناشتے اور کھانے کی میز پر بیٹھ کر سب گھر والے گپ شپ لگاتے۔ جس میں گھریلو امور، سیاست، کتابوں اور روزمرہ تجربات پر بات ہوتی۔ ہنسی مذاق چلتا، قہقہے گونجتے ٹی وی کی ایجاد کے بعد لوگ اکثر اس مسئلہ پر بات کرتے کہ اب گھر کے افراد کو ایک دوسرے کو دینے کے لیے وقت نہیں ہے، لیکن ہمارے گھرانے میں پھر بھی کوئی تبدیلی نہ آئی۔ جو بات ہمیں ایک دوسرے کی دوسراہٹ میں محسوس ہوتی تھی اس کا کوئی نعم البدل آج تک ہمیں دستیاب نہ ہوسکا۔

ایک روز ڈاکٹر بھائی بتانے لگے۔

''آج میں کلینک کے مردانہ حصہ میں مریض دیکھ رہا تھا کہ ایک لڑکا گھبرایا ہوا اندر آیا اور کہنے لگا کہ میری امی کی طبیعت بہت خراب ہے۔ آپ برائے مہربانی پہلے انہیں دیکھ لیں۔ میں جلدی سے خواتین کے کمرے میں گیا تو ایک بہت موٹی، ادھیڑ عمر خاتون بیٹھی ہانپ رہی تھیں۔ میں نے کہا۔

''جی بتائیے''

''پتر کی دساں۔۔۔ بڑے دِناں دی تیرے کول آونا چاہندی ساں پر آ نہیں سکی تے ایہہ حال ہو گیا اے۔''

''جی۔۔۔ کیہ محسوس کردے او''

''محسوس گھٹّا (خاک) کرنا اے۔ تیرے سامنے ای اے۔ بس کھادا پیتا نہیں لگدا۔''

○○○

ع علموں بس کریں او یار (بلھے شاہ)

ایک روز میں بھائی جان کو بتانے لگی۔

''بھائی جان آج میں بازار گئی، مجھے ایک دوپٹہ خریدنا تھا، لیکن دکاندار بہت زیادہ قیمت بتا رہا تھا۔ یہ لوگ تو منافع کی شرح کا کچھ خیال نہیں رکھتے۔ میں نے قیمت کم کرنے کو کہا، تو کہنے لگا۔

''آپ تو پڑھی لکھی ہیں، آپ تو میری بات سمجھیں نا!''

اور پھر تھوڑی سی تکرار کے بعد، یقین مانیں، وہی دوپٹہ تقریباً آدھی قیمت میں دے دیا۔

بھائی جان کہنے لگے:

''تمہیں تو اسے دوگنا قیمت ادا کرنا چاہیے تھی۔''

''وہ کیوں؟''

''بہت بھلا آدمی ہوگا، جسے تم 'پڑھی لکھی' تو لگیں۔ اب بے شک کتابیں شتابیں پڑھنا چھوڑ دو۔''

OOO

''ہور چوپو''

میں کالج جاتی تو ٹی بریک میں سب مجھ سے لطیفہ آف دی ڈے اور شعر آف دی ڈے کی فرمائش کرتے۔ لطیفے سننا اور سنانا میرے میکے گھر میں سبھی کا شوق تھا۔ ڈاکٹر بھائی اور میں تو اس کے بہت ہی رسیا تھے۔

ایک روز میں نے ضیاؔ جالندھری کا ایک شعر سنایا جو مجھے بہت پسند ہے۔

ے میں کہاں پہنچا کہ ہر بت جسے پوجا اب تک
ہے شکستہ سرِ خاک اور میں شکستہ تر ہوں

میری ایک کولیگ جو اسلامیات پڑھاتی ہیں، بھی اتفاق سے ادھر ہی بیٹھی تھیں۔ ویسے وہ ہمارے میس میں شامل نہیں تھیں۔ انہوں نے شعر بغور سنا، بہت تعریف کی اور پھر اس کی 'تشریح' کرتے ہوئے حضرت ابراہیم والا واقعہ سنایا کہ کس طرح وہ خانہ کعبہ کے بت گرا دیا کرتے تھے اور لوگوں کے استفسار پر انہوں نے کہا تھا کہ انہی بتوں سے پوچھو کہ ان کی یہ حالت کون بناتا ہے؟

اس کے بیان بالتفصیل کے بعد انہوں نے یقینِ کامل کے ساتھ کہا:

''بس مس جی، بت تو پھر شکستہ ہی ہوتے ہیں نا!''

باقی سب لوگ خاموشی سے ایک دوسرے کا منہ دیکھنے لگے کہ ایسی بات پر ہنس کر اسلام کے دائرہ (جو کچھ لوگوں نے نہ جانے کہاں بنا رکھا ہے؟) سے خارج تو نہیں ہونا تھا!

میں نے بھائی جان کو سب بتایا تو دل کھول کر ہنسے اور کہنے لگے:

''ہور چوپو''

OOO

چار چوفیرے، درد ہنیرے، ہنجو ڈیرے ڈیرے

میں اور بھائی جان جب بھی اکٹھے بیٹھتے، تو کسی نہ کسی معاشرتی مسئلہ پر بات شروع ہو جاتی۔ وہ انتہائی زیرک اور باریک بین تھے۔ ان سے بات کرنے کے بعد مجھے احساس ہوتا کہ جس انداز سے اور جس پہلو سے وہ اس معاملے کو دیکھتے ہیں میں نے تو کبھی اس طرح سے اس پر غور ہی نہیں کیا تھا۔ ان سے گفتگو، پر مغز ہوتی جو وہ نہایت لطیف انداز میں کرتے۔ کبھی 'خطیبانہ جوش و جذبہ' میں نے ان میں نہیں پایا۔۔۔ بس صرف سکون اور ٹھہراؤ۔۔۔ مدھم سی مسکراہٹ اور شگفتگی کے ساتھ، ماتھے پر بل ڈالے بغیر۔

ہمارے معاشرے میں عورت کے لیے جو گھٹن پائی جاتی ہے ایک روز اس پر بات ہونے لگی کہ اخباریں اور ٹی وی کے خبرنامے، عورت پر جسمانی تشدد اور غیرت کے نام پر قتل سے بھرے پڑے ہیں۔ آخر کیوں؟ تو کہنے لگے۔

''یہ ہمارے معاشرے کے دوہرے معیار ہیں وہی بھائی، جو دوستوں میں بیٹھ کر اپنے متعدد معاشقوں کا ذکر بہت فخر سے کرتا ہے۔ بہن کی شادی کرتے ہوئے اس کی رضامندی جاننا بھی گوارا نہیں کرتا اور مزے کی بات یہ ہے کہ اپنی چار شادیوں میں اسی مذہب کو اپنی ڈھال بنائے رکھتا ہے۔ جس کے مطابق شادی کے وقت لڑکی کی رضامندی جاننا انتہائی مستحسن خیال کیا جاتا ہے اور اکثر اوقات یوں بھی ہوتا ہے کہ اگر بہن، اپنے والد کی

جائیداد میں سے اپنا حصہ مانگے تو اس کو قتل کر کے غیرت کا لیبل لگا دیتے ہیں اور آلہ قتل کے ساتھ خود کو پولیس کے حوالے کر دیتے ہیں تاکہ فوری اشتعال یا غیرت کے نام پر ان سے رعایت برتی جائے۔۔۔ پھر انہوں نے اپنی ایک پنجابی نظم سنائی (وہ پنجابی میں شاعری بھی کرتے تھے۔ میرا خیال ہے کہ بہت کم لوگ اس سے واقف ہوں گے)

اک کُڑی پنجابن

سن او ربّا میریا
میں ڈبدی ڈبدی جاں
بھنوں ویر دے ربّا میریا
کرے سر میرے تے چھاں

اوہ گھبرو ہووے پنجاب دا
اوہدے ہتھ ہووے تلوار
میں ویاہ کراں جے جی لگدا
کرے ٹوٹے میرے چار

ہووے دھون نیویں اوہدے ویریاں
اوہدے مچھاں وٹّن یار
مینوں وڈھ کے ٹھانے ٹر جاوے
جا دسّے ٹھانے دار نوں

میں وڈھ لئی بھین اج اپنی
نالے وڈھیا اس دا یار
اوس میتھوں پچھیاں بنا ای
کھلوا لئی اپنی نتھ

مینوں پھاہے ناں لاناں ویریو
بس لایو ترے سو ست (۳۰۷)

○○○

لنگھ آؤ

ڈاکٹر بھائی، مجھ سے بارہ سال بڑے تھے۔ میرے لیے بہت محترم تھے لیکن ساتھ ہی ساتھ، بے تکلفی اور دوستی بھی بہت تھی۔ بہت سے بہن بھائی جن میں ایسے تعلقات نہیں ہوتے اس کا اندازہ نہیں کر سکتے۔ ہم دونوں لطیفہ گوئی کے شوقین تھے۔ دیگر لطائف کے علاوہ، وہ مجھے پروفیسروں کے لطائف سناتے اور میں انہیں ڈاکٹروں کے۔

ایک روز میں نے چہک کر کہا: ''بھائی جان، لطیفہ سنیے۔

ایک شخص کا گلا خراب تھا، وہ ڈاکٹر کو دکھانے کے لیے ان کے گھر گیا اور بیٹھی بیٹھی آواز میں کہنے لگا: ''ڈاکٹر صاحب، گھر پر ہیں؟''

ڈاکٹر کی بیوی نے، جواباً راز دانہ انداز میں کہا: ''نہیں ہیں۔۔۔ چلے آؤ۔''

بھائی جان بہت ہنسے۔ ایسی فضول باتوں پر (جو میں اکثر و بیشتر کرتی ہی رہتی تھی) وہ بڑے پیار سے کہتے۔

''باندری''

اور یہ لفظ اتنا محبت بھرا ہوتا کہ میرا دل چاہتا 'باندری' ہی بنی رہوں۔

○○○

انّھے اگّے رونا، اکھیاں دا اُجاڑا

میرے ابا جی، پیروں فقیروں، درگاہوں اور گنڈے تعویزوں کے قطعی طور پر قائل نہیں تھے۔ میں نے اپنی امّی کے منہ سے بھی کبھی ایسا ذکر نہیں سنا۔ یہی بات ہم بہن بھائیوں میں بھی ہے۔ ہماری معاشرے میں نفسیاتی امراض کو جنّوں اور پریوں کے کھاتے میں ڈال کر نام نہاد پیروں اور عاملوں سے مدد چاہی جاتی ہے۔ وہ موٹی موٹی رقمیں اور زیورات ہتھیانے کے علاوہ خاندانوں میں دُشمنیاں پیدا کرنے کے بھی ماہر ہیں۔ گرم سلاخوں سے داغنا، جسمانی تکالیف پہنچانا اور بعض اوقات اِتنا تشدد کہ جنّوں کے شکار کا اپنی جان سے گزر جانا معمولی بات ہے۔

بھائی جان کہتے تھے کہ میں اپنے مریضوں کو یہ سب سمجھا سمجھا کر تھک گیا ہوں لیکن صدیوں سے چلی آ رہی یہ بات اتنی جلد سمجھ میں آنے والی نہیں ہے۔ اس لیے اب میں اپنے مریضوں سے کہتا ہوں کہ گنڈا تعویز جو دِل چاہے کروائیں لیکن ساتھ ساتھ براہِ کرم میری بتائی ہوئی دوا ضرور کھائیں اور جب ٹھیک ہو جائیں تو پیر صاحب کی درگاہ پر کالا بکرا چڑھا آئیں۔

○○○

ع روندا مول نہ سوندا ای (شاہ حسین)

بھائی بتاتے ہیں۔

''2-D سے اتر کر مریض میرے چھوٹے سے کلینک میں آتا ہے۔ گردن موڑ کر دیکھتا ہے کہ پرانا A.C صحیح طور پر کام نہیں کر رہا۔ سفید کلف سے کڑکڑاتا سوٹ جس میں سونے کے کف لنکس لگے ہیں کا کالر کھینچ کر پیچھے کرتا ہے۔ ہاتھ میں بلیک بیری ہے۔ ماتھے پر بل اور پریشانی کے آثار۔ میں متوجہ ہوتا ہوں۔

''جی کہیے، کیسے ہیں؟''

''کہنا کی اے۔ پریشانیوں نے زندگی عذاب کر رکھی ہے۔ دن بے چینی میں گزرتا ہے۔ رات کو نیند نہیں آتی۔ فکریں جان کو لگی ہیں۔''

میں ایک سائیکاٹرسٹ ہوں، سنتا زیادہ اور کہتا کم ہوں۔ مریض کہے جا رہا ہے۔

''کوئی ایک مصیبت ہو تو انسان برداشت کر لے۔ یہاں تو ڈھیر لگے پڑے ہیں۔ تین بیٹوں کو تو میں نے الگ الگ فیکٹریاں لگا دی ہیں۔ چوتھے کی ابھی تک نہیں لگا سکا۔ ملک کے حالات ہی بھین۔۔۔ اتنے خراب ہیں۔ دو بیٹیوں کی شادی کر لی ہے۔ انہیں ڈیڑھ ڈیڑھ سو تولے سونا ڈالا ہے۔ باقی چیزوں کو تو چھوڑیں۔۔۔ اب دو کی باقی ہیں، انہیں بھی اتنا ہی دوں گا۔۔۔ یہ میرا 'اصول' ہے۔ حکومت کی ماں۔۔۔ بندہ یہاں کیا کرے؟ کوئی

دوائی لکھ دیں، کم از کم رات کو تو نیند آ جائے۔ ورنہ سکون کی تو۔۔۔"

میں نے کہا:

"جی، دوا میں لکھ دیتا ہوں، لیکن ایک بات بتائیں کبھی شکر بھی کیا ہے؟

جواب ملا:

"کادا؟"

ooo

اَسیں موریوں لنگھ پیا سے (شاہ حسین)

بھائی جان میرے ہاں آئے تو ان کے ہاتھ میں ایک لفافہ تھا، جس میں دوا کا Sample تھا۔ انہوں نے مجھے کہا کہ فلاں دوا جو تم کھا رہی ہو، جب ختم ہو جائے تو اُس کی جگہ یہ کھانا۔ میں نے پوچھا کہ آپ نے دوا تبدیل کر دی ہے تو کہنے لگے کہ نہیں یہ وہی دوا ہے۔ دوسری کمپنی کی ہے۔ آئندہ یہی خریدنا۔ قیمت میں کافی فرق ہے۔

پھر انہوں نے وضاحت کی۔

"ایک کمپنی جب کافی عرصہ ریسرچ کرنے اور دوا کی آزمائش کے بعد اسے مارکیٹ میں لاتی ہے تو اسے یہ حق حاصل ہوتا ہے کہ اس کی قیمت اپنے حساب سے مقرر کرے۔ جو کہ زیادہ اس لیے ہوتی ہے کہ ریسرچ پر اٹھنے والے اخراجات بہت زیادہ ہوتے ہیں۔ پانچ سال تک کوئی دوسری کمپنی وہی Salt استعمال کر کے دوا نہیں بنا سکتی۔ اس مدت کے گزرنے کے بعد دوسری کمپنیاں بھی اپنے نام سے وہی دوا بناتی ہیں تو اس کی قیمت نسبتاً بہت کم ہوتی ہے۔ اسے me too بھی کہتے ہیں۔"

پھر کہنے لگے۔

''آج اس کمپنی کا 'میڈیکل رپ' آیا اور دوا کا تعارف بتانے کے بعد کہنے لگا کہ آپ اسے مریضوں کے لیے لکھیں گے؟ تو میں نے کہا کہ ضرور لکھوں گا، کیونکہ مجھے مہنگی کمپنی کی دوا لکھ کر دنیا کی سیر کا شوق نہیں۔ (سب جانتے ہیں کہ آج کل میڈیسن کمپنیاں، ڈاکٹرز کو اپنی مہنگی ادویات تجویز کرنے کی ترغیب دلانے کے لیے، مختلف ممالک کی سیر کے لیے ٹکٹ اور رہائش کے اخراجات کے علاوہ بہت سی قیمتی اشیا دیتی ہیں) میرے نزدیک، مریض کا صحت یاب ہونا ضروری ہے جو نہ جانے کن مشکلوں سے علاج کروا رہا ہے۔ میرا سیر پر جانا ضروری نہیں ہے۔''

OOO

اجیہا بھارا اُچکنا سو کھائیں

بھائی جان کو میں اکثر بتاتی کہ میرے گھٹنوں میں بہت تکلیف ہے۔ وہ مجھے کیلشیم کھانے کا مشورہ دیتے اور چہل قدمی کرنے کو کہتے۔

ایک روز کہنے لگے:

''بیٹا، آج میں تمہیں اصل بات بتاتا ہوں (میں سمجھی شاید اسے کینسر کے ذیلی اثرات سے منسلک کریں گے) گھٹنے اللہ تعالیٰ نے چلنے کے لیے بنائے ہیں 'بار برداری' کے لیے نہیں۔ انہیں 'چنگ چی لوڈر' مت بناؤ۔ اپنا وزن کم کرو۔''

OOO

تیری یاد پوے تے روواں
تیرا ذکر کراں تاں ہساں (فیض)

بھائی جان جب بھی آتے مجھے چہل قدمی کرنے کو کہتے کہ اس سے ڈپریشن بھی کم ہوگا اور وزن بھی، لیکن یہ واحد کام ہے جس میں مَیں نے بھائی کی ایک نہیں سنی۔

یہ میرا فخر نہیں، شرمندگی ہے۔

میں کبھی خود کو اس پر آمادہ نہ کر سکی۔ الٹا، ان کی بات کے جواب میں عجیب وغریب باتیں کہتی۔

''بھائی، وزن زیادہ ہے نا اس لیے کشش ثقل ملنے نہیں دیتی۔''

وہ جل کر کہتے:

''یہ نظریہ کب آیا؟''

کبھی کہتی:

''بھائی، جب میں واک کرتی ہوں تو میرے اندر سے غائبانہ آواز آتی ہے جو حکماً کہتی ہے:

'آرام سے بیٹھ جاؤ'

خیال کیجیے، کہیں مجھے Hallucination تو نہیں ہونے لگیں؟''

اور ایسی ہی فضولیات۔۔۔

ایک روز وہ کہنے لگے:

''تم سیدھا سیدھا انکار کر دیتی ہو، ارادہ تو کرو، شاید کر پاؤ۔''

میں نے جواب میں کہا:

''بھائی جان، ایک شخص تبلیغِ دین کے لیے گیا اور دس روز کے بعد لوٹا۔ تھوڑی دیر کے بعد، اس کے گھر سے، اس کے زور زور سے چلّانے اور اس کی بیوی کی چیخ و پکار سنائی دی۔ اس کے ہمسائے بھاگتے ہوئے آئے تو دیکھا کہ وہ شخص اپنی بیوی کی بری طرح پٹائی کر رہا ہے۔

لوگوں نے پوچھا کہ کیا ہوا ہے؟ اتنا ظلم کیوں کر رہے ہو؟

اُس شخص نے جواب دیا کہ میں اسے داڑھی رکھنے کا کہہ رہا ہوں اور یہ۔۔۔

لوگوں نے کہا:

''وہ داڑھی کیسے رکھ سکتی ہے؟''

اِس پر وہ بولا:

''یہ کمبخت بھی یہی کہتی ہے۔ میں کہتا ہوں، نہ رکھے۔۔۔ کم از کم ارادہ تو کرے۔''

ooo

❀

؎ چپ کر کے کریں گزارے نوں
سچ سن کے لوک نہ سہندے نیں
سچ آکھیے تاں گل پیندے نیں (بُلھے شاہ)

سوشل سکیورٹی کے جریدہ 'مرہم' کے ایک شمارے میں ڈاکٹر شکیل شمسی نے ادارے کے ڈاکٹروں کا ایک سروے کیا۔ عنوان تھا:

''کیا سوچتے ہو تنہائی میں؟''

جس کا جواب ڈاکٹر بھائی نے یہ دیا۔

''وہ جس پر جہلاء اور علماء کی قدغن نہ ہو''

اس پر ڈاکٹر شکیل شمسی نے تبصرہ کیا۔

''وہ جو آپ کے مریض سوچتے ہیں؟''

ان کا تبصرہ بالکل صحیح تھا۔ یہ دیوانوں ہی کا کام ہے۔ فرزانوں کا نہیں۔ 'بقائمی ہوش وحواس' اپنے آرام کو تج دینا۔ نہ بینک بھرنا، نہ محل ماڑیاں تعمیر کرنا، نہ ادویات کی کمپنیوں کے فراہم کردہ اخراجات پر دنیا کی سیر کرنا، نہ 2-D کی چابیاں لینا۔۔۔ وغیرہ۔ آج کل

ایسے لوگوں کو ذہنی مریض ہی گردانا جاتا ہے۔

لیکن جہلا اور علما کی قدغن کو نظر انداز کر کے وہ لکھتے، تو میں ڈر جاتی۔

''بھائی جان۔ میں خوفزدہ ہو جاتی ہوں۔ ایسی باتیں سوچ ضرور لیا کریں لیکن خدارا لکھا نہ کریں۔ 'یہ' بہت ظالم لوگ ہیں۔''

''تو کیا ڈر کر اندر بیٹھ جاؤں؟ کچھوے کی طرح گردن چھپا لوں؟ جو سمجھتا نہیں یا سمجھنا نہیں چاہتا۔ اس کا مسئلہ تو الگ ہے۔ ظلم کو دیکھتے ہوئے چپ رہنا بزدلی نہیں، بے ایمانی ہے۔''

وہ بے ایمان نہیں تھے۔

؎ توں خلقِ خدا نال پیار تے کر
ربّ صرف مسیتاں چ نہیں ملدا

ooo

جو رنگ رنگیا، گوڑھا رنگیا (بُلّھے شاہ)

بھائی جان کا مطالعہ بہت وسیع تھا۔ ادب، شاعری، فلسفہ، سیاست۔۔۔اور کیا نہیں۔ سارا وقت کوئی نہ کوئی کتاب ان کے پاس ہوتی۔ بڑی بیٹی کو سکول سے لینے جاتے تو ویسپا سکوٹر میں لگے ریک میں کوئی کتاب ہوتی اور سکول میں چھٹی ہونے کے انتظار میں کتاب پڑھتے رہتے۔

اسی طرح، دوسروں کو بھی بہت دھیمے انداز میں مطالعہ کی ترغیب دیتے رہتے۔ کبھی سختی سے نہیں کہا۔ اب ان کے جاننے والوں میں، بہت سے لوگ جو مطالعہ کا شوق رکھتے ہیں، کہتے ہیں کہ اس میں دِل چسپی انھی کی پیدا کردہ ہے۔

میں آتے جاتے، بھائی جان کے کلینک پر ضرور رُکتی، چاہے دومنٹ کے لیے ہی سہی۔ ایک روز ایسے ہی گئی تو حسبِ معمول مجھے باہر گاڑی تک چھوڑنے آئے۔ میں لائبریری سے آئی تھی اور چند کتابیں اور میرے ہاتھ کے لکھے ہوئے کچھ کاغذات پچھلی سیٹ پر پڑے تھے۔ دیکھ کر کہنے لگے۔

''لگ رہا ہے نا کسی پڑھے لکھے کی گاڑی ہے۔ اکثر لوگوں کے گھروں میں تو ایک پرزہ بھی پڑھنے کو نہیں ملتا۔''

اسی طرح دھیرے دھیرے پڑھنے لکھنے کا پرچار کرتے رہتے اب وہی رنگ مجھ پر بھی غالب ہے۔

اگرچہ

'چہ نسبت خاک، را بہ عالم پاک والا معاملہ ہے۔'

یہاں، بھائی کی نذر عمر خیام کی ایک رُباعی کر رہی ہوں۔

(انگریزی ترجمہ)

"With them the Seed of Wisdom did I sow,
And with my own hand
labour'd it to grow;
And this was all the Har'vest
that I reaped......
I came like Water, and like Wind I go.

ooo

صلاح مُفت

ایک روز بھائی جان میرے ہاں آئے ہوئے تھے۔ ہم بیٹھے باتیں کر رہے تھے کہ گھنٹی بجی اور ہمارے ایک عزیز تشریف لائے۔ سلام دعا اور خیر خیریت معلوم کرنے کے بعد انہوں نے بھائی سے کہا کہ اچھا ہی ہوا آپ سے یہاں ملاقات ہوگئی ورنہ اتنی دور آپ کے کلینک پر جانا پڑتا۔ پھر انہوں نے اپنے اہلِ خانہ کے 'چند' افراد کے لیے نسخے لکھوائے اور بعد میں مجھ سے مخاطب ہوئے۔

''یہ باہر گاڑی کس کی کھڑی ہے؟''

میں نے جواب دیا۔

''بھائی جان کی۔''

انہوں نے تقریباً چلاّتے ہوئے کہا۔

''ڈاکٹر صاحب دی۔۔۔؟''

پھر وہ بھائی کے سامنے ہاتھ جوڑ کر کھڑے ہو گئے اور بولے۔

''ڈاکٹر صاحب۔۔۔تھوڑی خدا خوفی''

بھائی جان کے چہرے پر دھیمی سی مسکراہٹ ابھری، وہی مہان مسکراہٹ، جو ان کا 'ٹریڈ مارک' تھی۔ جب وہ صاحب چلے گئے تو بھائی جان زور سے ہنسے اور کہنے لگے:

''کلینک پر آنے والے کبھی ایسے اصحاب جو فیس دینے میں یقین نہیں رکھتے، مفت مشورہ ضرور دیتے ہیں،

ڈاکٹر صاحب، گڈّی تے پچّ سواد دی رکھ لو۔''

ooo

ڈاکٹر مقبول اختر کی ڈائری کے دو صفحات

My candle burns at both
the ends
It will not last the
night
But Ah my foes and
Oh my friends
It gives a lovely light.

ع کدھرے نہ پیندیاں دسّاں، وے پردیسیا تیریاں (فیض)

بھائی کی ڈائری میں لکھے ہوئے چند الفاظ

دیکھو میں کدھر جا رہا ہوں — مر کے واپس کوئی نہیں آتا

ترکِ دنیا کا سماں، ختمِ ملاقات کا وقت

The last good bye -

ooo

۱۷ جنوری ۱۹۸۴ء کو میں نے پبلک سروس کمیشن کا امتحان پاس کیا تو بھائی نے ٹیلی گرام کے ذریعے مبارکباد کا پیغام بھیجا۔

میری سالگرہ پر بھیجے گئے کارڈ کا عکس
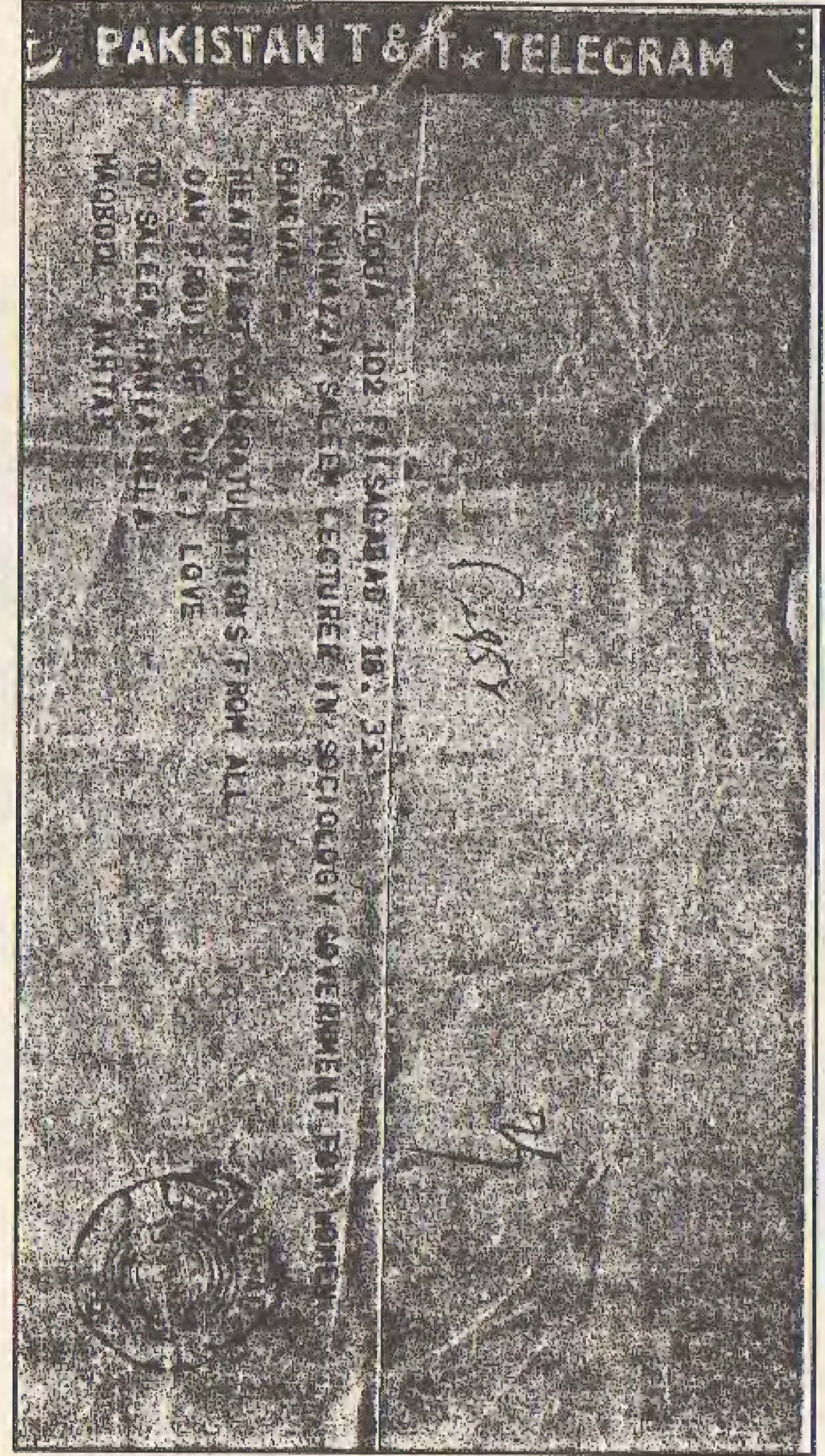
بھائی جان ہمیشہ کتاب کا تحفہ دیتے۔ ۱۹۸۹ء میں انہوں نے اپنی سالگرہ پر مجھے کتاب کا تحفہ دیا۔

زا کو

پیار سے

13-11-89

ڈاکٹر صاحب کے کلینک پر آنے والے مریضوں کو بنیادی معلومات فراہم کرنے کے لیے بنایا گیا ڈپریشن کی علامات پر مشتمل ورق۔ اس میں بھی ادبی رنگ جھلک رہا ہے۔

اداسی ٹھہر جاتی ہے

مسلسل اداسی، مایوسی، عدم دلچسپی، بات بے بات رونا، نیند ختم، خوشی ختم، سکون ختم، بھوک ختم، خواہش ختم، نہ گھر اچھا لگے نہ گھر والے، نہ اپنا آپ، نہ لباس کا شوق نہ میک اپ کا، نہ شیو کا، موت کی خواہش، یہ ڈپریشن کی بیماری کی علامات ہیں۔ یہ بیماری قابل علاج ہے۔

ڈاکٹر مقبول اختر

ایم۔بی۔بی۔ایس/ایم۔سی۔پی۔ایس (سائیکاٹری)

(سائیکاٹرسٹ)

میرے میاں نے ۲۰۰۴ء میں اپنا گھر بنایا تو House warming کی تقریب پر تحفے کے ساتھ دیے جانے والے کارڈز کے عکس۔

A new home opens the door to memories laughter and love

Congratulations

Congratulations On Your

New Home

Now hope you'll add some
special touches
you've been dreaming of
To make the new place
you call home
a place you'll really love!

May it give you all
the love & pleasures you
got from your
Parental home.

Sama / Zarfie

Lamia
Ahmad
Saboor
Amna

؎ جی کردا اے روئی جاواں، روئی جاواں
نین غماں دے چھوئی جاواں، روئی جاواں

چھوٹے بھائی اور ابا جی کی وفات کے بعد بڑے بھائی جان بھی رخصت ہوئے۔ ان کی وفات کے بارے میں مَیں نے اپنی کتاب 'پھول لاکھوں برس نہیں رہتے' میں 'تنگ دستی' کے عنوان سے لکھا۔

۱۶ ستمبر ۱۹۸۴ بڑے بھائی جان کی وفات کا دن۔۔۔ مجھے ادھورا کر گیا۔ یوں لگتا ہے جیسے Jig Saw Puzzle میں، میری تصویر کا ایک ایسا ٹکڑا گم ہو گیا ہے جس سے مَیں، مَیں نہیں رہی۔ ہمہ وقت نامکمل ہونے کا احساس میری شخصیت میں در آیا ہے۔ ہر دن کا آغاز اور ہر رات کی انتہا۔۔۔ ہر کام میں۔۔۔ ہر بات میں۔۔۔ ہر سوچ میں۔۔۔ ہر راہ میں۔۔۔ احساسِ محرومی کا خلا۔ وہ گنجِ گراں مایا کھو گیا تو تنگ دستی نے ڈیرے ڈال دیے۔

؎ دُکھن میرے
نیناں دے کوئے
وچ ہڑ ہنجواں دا آیا (شوکمار بٹالوی)

بڑے بھائی جان کی وفات کے بعد، ڈاکٹر بھائی کا میرے نام خط بھی انہی جذبات کا حامل ہے۔

ooo

ع ماواں دِھیاں ملن لگیاں

آج سے 35 سال پہلے جب میری شادی ہوئی تو میرے میاں کی پوسٹنگ دُور دراز علاقوں میں ہوتی رہی۔۔۔ کراچی کوئٹہ۔

تب مواصلات کا نظام ایسا ہی تھا۔ موبائل تو کیا فون کی سہولت بھی عام نہیں تھی۔ نہ میرے میکے میں فون تھا، نہ میرے گھر میں۔ میں بہت با قاعدگی سے لمبے لمبے خط، سب کو نام بنام لکھتی اور اسی طرح جواب میں ابا جی اور بہن بھائیوں کے خط مجھے ملتے اور جب کبھی میکے میں چند روز گزار کر واپس جاتی تو بہت آزردہ ہوتی لیکن امّی کے سامنے کبھی دِل برا نہ کرتی۔ امّی بھی بہت حوصلے سے رُخصت کرتیں (اب چھوٹی بھابھی بتاتی ہیں کہ میرے جانے کے بعد بہت روتیں۔)

لیکن جب ابا جی اور بھائیوں کی وفات کے بعد ایسا ہوتا کہ میں میکے آ کر واپس جاتی تو ضبط نہ کرسکتی۔ امّی بھی بہت روتیں۔ ایک بار ایسے ہی میں امّی کے گلے سے لگی رو رہی تھی تو ڈاکٹر بھائی جو پاس ہی کھڑے تھے کہنے لگے۔

''کیوں ساڈے چبارے دیاں کندھاں ہلان لگی ایں۔''

لوک گیت کچھ یوں ہے:

ے ماواں دھیاں ملن لگیاں
چارے کندھاں نے چبارے دیاں ہلیاں

ع دکھاں دی روٹی، سولاں دا سالن، آہاں دا بالن بال نی (شاہ حسین)

چھ مارچ ۱۹۸۵ء کو میری امی بھی، دو بیٹوں، شوہر اور بھائی (میجر اسحٰق محمد) کی وفات کے صدمات کو نہ جانے کیسے برداشت کر کے چل بسیں۔

میں ان دنوں چکوال میں تھی۔ ڈاکٹر بھائی نے نو اپریل ۱۹۸۵ء کو یعنی امی کی وفات کے ایک ماہ بعد مجھے جو خط لکھا اس کا عکس آپ بھی پڑھیے۔

OOO

Dr. Maqbool Akhtar
M.B.,B.S.

246-B GULBERG
FAISALABAD

Dated 9-4-1985

راجا بیٹا۔ السلام علیکم

کل رات یہاں بہت بارش ہوئی - کل رات
بھی ہوئی تھی - اور آج صبح سے تو چھاجوں مینہ برس رہا تھا - کوئی
دس بجے کے قریب رکا ہے تو فلیٹ آیا ہوں۔ آپ کا خط ملا
خیریت [illegible] کی خوشی ہوئی -

اکیلے تو آ سکتی ہیں اور یہ اکیلا پا رہا ہے
جو وہ کسی کی جگہ کاٹ نہیں سکتا - یہ تو [illegible] کی طرح
اکیلے اکیلے اس عمل سے گزرنا ہوگا اور یہ کوئی بات نہیں جو ہم یا تمہارا کوئی
بات بہت بڑی اس عمل کو آسان نہیں کر سکتا سوائے اس بات کے کہ
یہ احساس کہ کوئی پیارا اس دکھ کو سمجھتا ہے، اس دکھ میں شریک ہے
رنج دکھ والے سے۔ اس عمل کو برداشت کے قابل بنا دیتا ہے —

A Aeath in the family کی کتاب میں ایک ناول کا Psychiatry
کا حوالہ دیا ہوا ہے - ہیروئن کا خاوند ایک ایکسیڈنٹ میں مر جاتا ہے
اس کا باپ اسے سمجھاتا ہے کہ بہت سے دن تو نہیں اس نقصان
(loss) کا اندازہ کرنے میں لگ جائیں گے اور پھر اس کے بعد .....
یہ نقصان شدید محسوس ہو جائے گا

"It will be so much worse you will think it is more than you can bear. Or any other

human being. And worse than that, you will have to go ~~through it alone~~, ~~the~~ because there isn't a thing on earth any of us can do to help, beyond blind animal sympathy."

What a grief-stricken person needs is "common-sense" love of life, and what we are accustomed to call ego strength, that is, endurance, courage, and the ability to face up to things.

یعنی [illegible] تعریفیں ——

Iran from grief; grief ran and overtook me.

صرف وقت مرہم ہے — جو ہر [illegible] اور سب کا تجربہ ہے [illegible]
چھ ماہ کے عرصے پر زندگی کا احساس [illegible] اس وقت تو ایسا لگتا ہے
جیسے [illegible] پلیٹ فارم پر کھڑا ہو [illegible]

والسلام
مقبول اختر

محبتاں سچیاں نیں

امّی، ابا جی اور بھائیوں کی وفات کے بعد دکھ، پریشانیوں، مسائل اور غمِ روزگار نے ڈاکٹر بھائی کو گھن چکر بنا دیا۔ ابا جی کی پنشن بند، بھائیوں کی آمدنی بند لیکن زندہ لوگوں کی ضروریات وہیں کی وہیں۔ وہ سگریٹ تو پیتے ہی تھے لیکن اب اس میں شدّت آ گئی کہ اس میں عارضی پناہ ڈھونڈتے تھے۔ میں نے ان سے اسے کم کرنے کو کہا تو کہنے لگے۔

''یہ Lesser evil ہے''

ان کے عزیز ترین دوست، ڈاکٹر احسان الحق نے انہیں اپنا مکمل چیک اپ کروانے کے لیے کہا، کیونکہ گھرانے کی چاروں وفات عارضۂ قلب کی وجہ سے ہوئی تھیں۔ ان کا ETT (Exercise tolerence test) ہوا تو دل کے حالات دگرگوں تھے۔ ڈاکٹر صاحب نے کہا:

''اب آپ اپنی آخری سگریٹ پی لیں اور بس!''

واپس آ کر ڈاکٹر بھائی نے بتایا۔

''میں نے سگریٹ سلگائی اور 'جرعہ جرعہ' کر کے پی۔ پھر بھری ہوئی ڈبیا، کوڑادان

میں پھینک دی اور ہاتھ جھاڑ لیے۔''

اس کے بعد، انہوں نے واقعتاً ہاتھ جھاڑ لیے اور تا عمرِ رواں سگریٹ کو ہاتھ نہیں لگایا۔

ایک دن باتوں باتوں میں، میں نے کہا:

''آپ نے بہت ہمت سے سگریٹ نوشی ترک کی ہے ورنہ اچھے اچھوں سے یہ کام نہیں ہوتا۔ وہ چھوڑ کر دوبارہ شروع کر لیتے ہیں۔ آپ کا کبھی دل تو نہیں چاہتا؟''

تو ہنس کر جواب دیا:

''میں نے ایک مریض کو سگریٹ پینے سے منع کیا اور کوئی دو ماہ کے بعد اس سے پوچھا کہ کبھی سگریٹ تو نہیں پی؟ وہ کہنے لگا۔

''ڈاکٹر صاحب، پیتی تے نہیں، پر دل وچوں ایدی حُبّ، نہیں جاندی۔''

میں نے بھی ہنس کر بھائی جان سے کہا:

''اچھا تو ساحر لدھیانوی آپ کے لیے ہی کہہ گئے ہیں

؎ 'محبت' ترک کی میں نے، گریباں سی لیا میں نے
زمانے اب تو خوش ہو زہر یہ بھی پی لیا میں نے''

ooo

ع   مِتراں دی چُھمانی کارن دِل دا اُہو چھانی دا (شاہ حسین)

اگست ۱۹۸۱ کو مجھ سے بڑے بھائی مسعود صفدر، جن کی عمر اس وقت ۳۵ سال تھی، وفات پا گئے۔ اس کے سات ماہ کے بعد میرے بڑے ماموں میجر اسحاق محمد جو میرے سسر بھی تھے، چل بسے۔ ان کی وفات کے ٹھیک اڑھائی ماہ بعد ابا جی بھی رخصت ہوئے۔ ان کے جانے کے دو سال بعد بڑے بھائی جان بھی رات کو سوتے میں داغ مفارقت دے گئے۔ امی یہ تمام جانکاہ صدمات برداشت کرنے کے بعد، پانچ ماہ بیس دن کے وقفے سے ساتھ چھوڑ گئیں۔

امی کی وفات کے گیارہ ماہ کے بعد ڈاکٹر بھائی کا بائی پاس آپریشن ہوا۔ تب یہ آپریشن بہت عام نہیں تھا۔ صرف آرمڈ فورسز انسٹیٹیوٹ آف کارڈیالوجی راولپنڈی یا کراچی میں ہوتا تھا۔ ہمارے خاندان میں ہونے والی پے در پے اموات کو دیکھتے ہوئے، سب لوگ بھائی سے کہتے کہ آپ اس کے لیے بیرونِ ملک چلے جائیں، لیکن 'گھریلو معیشت' اس کی متحمل نہیں تھی۔ ہم دونوں بہنوں نے اپنی جائیداد جو ابا جی کی طرف سے ہمیں منتقل ہونی تھی، بیچ دینے کو کہا، لیکن بھائی جان کسی طور بھی اس پر راضی نہ ہوئے۔ انہوں نے راولپنڈی CMH میں ڈاکٹر صاحب سے ملاقات کی۔ انہوں نے پوری تسلی کروائی اور بھائی جان کا

آپریشن ۸ فروری ۱۹۸۶ء کو ہو گیا۔

اب تو یہ بات بتاتے ہوئے دو منٹ لگتے ہیں لیکن تب ہم جس کیفیت میں سے گزر رہے تھے، اس کا سامنا کرنا بہت دل گردے کا کام تھا۔ ڈاکٹر بھائی کی اپنی بچیاں بھی چھوٹی چھوٹی تھیں، پھر چھوٹے بھائی کے بچے، جذباتی طور پر سارا خاندان ٹوٹ پھوٹ چکا تھا۔ ان دنوں تو ہم لوگ، دیوار کا بھی سہارا ملتا تو انکار نہ کرتے۔ میرے میاں، ان دنوں راولپنڈی میں تعینات تھے۔ انہوں نے وہاں تمام انتظامات کیے۔ ہمارے عزیزوں، دوستوں اور خیر خواہوں کی ہمدردی نے ہمیں اپنے پاؤں پر کھڑا رہنے کے قابل بنایا۔ بھائی کے آپریشن سے پہلے ہی سارا فیصل آباد، راولپنڈی امڈ آیا۔ دوست کیسے دکھ بانٹ سکتے ہیں یہ ہم ہی جانتے ہیں۔

بھائی جان کے لیے چودہ بوتل خون کی ضرورت تھی اور اس کے لیے اتنے لوگ بے تاب تھے کہ فیصلہ کرنا مشکل تھا کہ کسے چھوڑا جائے۔

میں اور آپا جی بھی خون دینا چاہتی تھیں لیکن سب نے یہ کہہ کر منع کر دیا کہ مہمانداری کی مصروفیت اتنی ہے کہ ہم لوگ وہی نپٹا لیں تو بہت ہے۔ تب میں نے 'منّت' مانی کہ جیسے دوسروں نے ہماری ضرورت پوری کی ہے، اسی طرح میں بھی ہر سال ایک بوتل خون، کسی ضرورت مند کو دیا کروں گی۔ چھ سال تک یہ بخیر و خوبی ہوتا رہا لیکن اس کے بعد میں خود شدید بیمار ہوئی تو یہ سلسلہ منقطع ہو گیا لیکن میں اب بھی ان سب لوگوں کے لیے دعا گو ہوں جنہوں نے اس مشکل میں ہمارا ساتھ دیا۔

جب ڈاکٹر بھائی، آپریشن کے لیے فیصل آباد سے راولپنڈی روانہ ہونے لگے تو چھوٹے بھائی کا نو سالہ بیٹا، اس گرم جوشی سے ان کے گلے ملا کہ انہیں ہوا میں اٹھا دیا۔ (تب اس کے والد کی وفات کو چار سال گزر چکے تھے) سب لوگ اس کے دلی جذبات سمجھ سکتے تھے۔ بھابی، بچیاں، ہم بہنیں اور دیگر عزیز تو پریشان تھے ہی، ایک زمانہ دست بدعا تھا

اور میں سوچتی تھی کہ اگر آج امی، ابا جی زندہ ہوتے تو کیا ہوتا؟

بھائی، بھابھی اور بچیوں کی فیصل آباد سے روانگی سے ایک روز پہلے میں راولپنڈی چلی گئی کہ ان لوگوں کی آمد سے پہلے میں، وقتی طور پر لیے جانے والے گھر کا انتظام سنبھال لوں۔ آپا جی کا ارادہ بھائی جان کے پہنچنے کے دو روز بعد آنے کا تھا۔

پہلی ہی رات کو صبح چار بجے، بھائی جان نے اچانک نیند سے بیدار ہو کر کہا:

''آپا جی آئے نیں؟''

اور اس کے دس منٹ بعد گھنٹی بجی تو سچ مچ آپا جی ہی آئی تھیں۔ آنا تو انہیں دو روز بعد تھا لیکن وہ رہ نہ سکیں اور اسی روز شام کو بس پر بیٹھیں اور صبح راولپنڈی پہنچ گئیں۔ تب فیصل آباد سے راولپنڈی کا سفر سات، آٹھ گھنٹے کا تھا۔

گھر میں فون بھی نہیں تھا، پھر بھائی جان نے کیسے کہہ دیا کہ آپا جی آئی ہیں۔

'یہ بات ٹیلی فون کی نہیں، ٹیلی پیتھی کی تھی۔'

برین ہیمرج کے بعد بھائی کی حِسِ سماعت بالکل ختم ہو گئی تھی، پھر بھی ڈاکٹرز نے سوچا کہ شاید آلۂ سماعت سے کوئی بہتری ہو جائے، لیکن ہیرنگ ایڈ کے لگنے پر بھی وہ کچھ سن نہ پائے اور ستم بالائے ستم یہ کہ اس بات کو سمجھ بھی نہ پائے۔ آلۂ سماعت لگانے کے بعد کہا:

''اب میری آواز آتی ہے؟''

جب جواب اثبات میں ملا تو کہنے لگے۔

''اب میں زور سے آواز دوں گا۔

آپا جی۔۔۔ آپا جی۔۔۔''

(آپا جی اسلام آباد میں ہوتی ہیں)

بائی پاس آپریشن ہونے کے چند روز بعد، لیٹے ہوئے 'ریڈرز ڈائجسٹ' پڑھ رہے تھے مجھ سے کہنے لگے:

''یونہی آپریشن کے چکروں میں پڑے، ڈائجسٹ میں ایک اور طریقہ بھی لکھا ہوا ہے۔''

''اچھا۔۔۔ وہ کیا؟''

انہوں نے ڈائجسٹ میرے سامنے کر دیا۔ ایک کارٹون تھا۔ ڈاکٹر مریض سے کہہ رہا ہے۔

''اس کا ایک ہی علاج ہے، بائی پاس''

مریض دکھایا ہے کہ ہاتھوں کے طوطے اڑے ہوئے ہیں اور ڈاکٹر کہہ رہا ہے۔

''بائی پاس فرج۔۔۔ بائی پاس بیکری۔۔۔ بائی پاس فاسٹ فوڈ۔۔۔''

OOO

✿

ادھی ادھی راتیں اُٹھ روواں موئے متراں نوں
مائے مینوں نیندر نہ پوے۔۔۔ (شوکمار بٹالوی)

سردیوں کی راتیں لمبی اور 'دُکھاں دیاں کہانیاں دکھاں توں وی لمّیاں' شدید ڈیپریشن میں ہوتی تو جانے والوں کا دکھ، ان دنوں دو چند ہو کر، مجھے آنسو رلاتا۔ عام دنوں میں میکے گھر کی چمکیلی اور خوش رنگ یادیں، ہنساتیں لیکن وہی یادیں اداسی کے دنوں میں میرا تکیہ بھگوتی رہتیں۔ ایسی ہی ایک رات کے بعد صبح میں نے بھائی کو فون کیا۔

''بھائی جان، رات بھر نیند نہیں آتی۔ غالب بن گئی ہوں۔ یادِ ماضی عذاب ہو گئی ہے۔''

جواب میں انہوں نے محسن نقوی کی ایک خوبصورت نظم مجھے 'ای میل' کی۔

''سفر تنہا نہیں کرتے
سنو ایسا نہیں کرتے
جنہیں شفاف رکھنا ہو
انہیں میلا نہیں کرتے
سفر جن کا مقدر ہو
انہیں روکا نہیں کرتے
بہت اُجڑے ہوئے گھر میں
بہت رویا نہیں کرتے''

ع چارے پلّے چونڑی، نین روندی دے بھِنّے (شاہ حسین)

زندگی بہت بے رحم ہے، میں نے تب تک یہ نہیں جانا تھا جب تک میرے سر پر ماں باپ کا گھنیرا سا سایہ تھا لیکن جب تین سال کے قلیل عرصہ میں، والدین کے ساتھ ساتھ، میرے تین میں سے دو جوان بھائی بھی رُخصت ہو گئے تو زندگی کی کڑی دھوپ کی تمازت نے مجھے راکھ کر دیا۔

میرے پاس اگرچہ اور بہت پیارے رِشتے تھے۔ آپا، ڈاکٹر بھائی، میرے شوہر اور میری اکلوتی اولاد۔۔۔ میری بیٹی، لیکن انسانی رِشتوں کی یہ خاصیت ہے کہ ایک رِشتے کی جگہ، دوسرا رِشتہ نہیں لے سکتا، ورنہ کوئی روئے کیوں؟

ماں، باپ جو بچے پیدا کرتے ہیں، وہ آپس میں بہن بھائی ہی ہوتے ہیں لیکن میں بڑے وثوق سے کہہ سکتی ہوں کہ ہم بہت مختلف بہن، بھائی تھے۔ شاید اسے 'زیبِ داستاں' سمجھا جائے۔ لیکن یقین مانیئے ہم پانچ بہن بھائیوں کی، ہمارے والدین نے نہ جانے کیسے تربیت کی تھی کہ موت کے علاوہ، ہم میں چند لمحات کی بھی جذباتی دُوری نہیں ہوئی۔ لوگ بات کرتے ہیں تو ڈیڑھ منٹ کے بعد ہی کسی نہ کسی وضاحت کی ضرورت پیش آ جاتی ہے۔

''نہیں۔۔۔نہیں، میرا یہ مطلب نہیں تھا آپ غلط سمجھے ہیں۔''

یا یہ کہ

''میں تمہاری بات کو خوب سمجھتا ہوں۔تم جو بھی کہو میں اندر کی بات جانتا ہوں۔''

وغیرہ

ہم پانچوں میں کبھی اس بات کی نوبت نہیں آئی۔ وہ بلاغت، وہ صراحت، وہ یقین، وہ ایمان، وہ ساتھ اور سانجھ کہ کبھی غلط فہمی نے ہمارے درمیان آنے کی جرأت نہیں کی۔ اِتنا پیار، محبت، بے تکلفی اور صاف دِلی کہ جو جس نے کہا اس کا وہی مطلب ہوتا۔ میں حیران ہوتی ہوں دوسروں میں اس بات کو کم دیکھ کر۔

امی، ابا جی اور دو بھائیوں کی وفات نے مجھے ادھ موا کر دیا۔ دو لفظوں میں یہ بات کہہ دی جاتی ہے کہ فلاں اِس دُنیا سے رُخصت ہو گیا لیکن اس کے بعد جن حالات میں سے ہم گزرتے ہیں۔ وہ ایک طویل اور انتہائی تکلیف دہ عمل ہے۔ میں جانے والوں کو یاد کرتی اور روتی۔ مصروفیت اگرچہ بے پناہ تھی۔ ملازمت، گھرداری، مہینوں بلکہ سالوں پر محیط بے تکی، تھکا دینے والی اور اعصاب شکن مہمانداری، خود گاڑی چلانا، گھر اور گھر سے باہر کے کام نپٹانا، پڑھنا، پڑھانا۔ لیکن میرا شعور، لاشعور اور 'عبدالشکور' (بقول شفیق الرحمٰن) ہمہ وقت میکے گھر کی یادوں سے بسا رہتا۔ اُداسی کی شکار میری شخصیت سے وہ رنگ کہیں اُڑ گیا جو کہ بے تحاشہ ہنسنے، ہنسانے پر مبنی تھا۔ ڈاکٹر بھائی مجھ سے کہا کرتے تھے کہ جتنا تم ہنستی ہو، اتنا سب ہنسیں تو اس دُنیا سے دُکھ دُور ہو جائیں۔ انھوں نے مجھ سے آخری بات بھی یہی کہی ''ہنستی رہنا'' (یہ کیونکر ممکن ہے؟ کاش اس بارے میں بھی کچھ کہتے!)

اور پھر:

؎ دیوار کیا گری میرے خستہ مکان کی
لوگوں نے میرے صحن میں رستے بنا لیے (سبط علی صبا)

گرنے والوں کو زمانہ ٹھوکروں پر رکھ لیتا ہے اور یہی ہوا۔ محض 'چند' رشتہ دار اور

بہت سے 'دوست سہارا نہ دیتے تو یہ بکھرا ہوا گھرانہ، جسے آپا، ڈاکٹر بھائی اور میں نے بڑی مشکلوں سے سمیٹا، نہ جانے کہاں تک بکھرتا چلا جاتا۔ میں اپنے میکے گھر میں سب سے کم حوصلہ ہوں لیکن عام لوگ میرے حوصلے کی مثال دیتے ہیں۔ اس سے اندازہ لگائیے کہ آپا اور ڈاکٹر بھائی تو حوصلے کے پہاڑ بلکہ کوہ ہمالیہ ہیں۔ میں، سٹاف رُوم میں اپنی کولیگز کی باتیں سنتی تو اکثر حیران ہوتی کہ کیا یہ بھی 'مسائل' ہیں جن پر 'پریشان' ہوا جا سکتا ہے؟

لیکن یہ سب مِل کر میرے جسم سے کینسر بن کر اُبھرا اور مرے کی لاش پر سو درّے والی بات ہو گئی۔ وہ زمانہ میرے لیے ایک بھیانک خواب کی مانند ہے۔ اس بیماری کے عفریت نے مجھے یوں تو ڈھیر کر دیا لیکن میں ٹوٹی نہیں۔ حوصلہ نہیں ہارا۔ ملازمت بھی جاری رکھی کہ اس کی ضرورت اور بڑھ گئی تھی۔ جیسی تیسی گھرداری بھی کی۔ اس دوران ڈاکٹر بھائی مجھے مزید ذہنی مصروفیت کی طرف مائل کرتے رہتے کہ میں لکھا کروں۔۔۔ اپنی طالبِ علمی کے زمانے کے شوق کو از سرِ نو جاری کروں۔ یہ سب وہ بہت دھیرج، سکون اور آہستگی سے ملاقات میں، ایک آدھ جملے کی صورت میں کہتے (ملاقات، جو بیماری کے دوران تو دِن میں چار چار بار بھی ہوتی۔ کلینک آتے اور جاتے ہر پھیرے میں) یوں جیسے ہلکی بوندا باندی، خشک زمین میں جذب ہوتی جاتی ہے۔

علاج☆ کے دوران مجھے بہت زیادہ Steroids استعمال کرنا پڑے۔ Steroids اور Depression کا معکوس تعلق ہے، سو

ع مرض بڑھتا گیا جوں جوں دوا کی

اس کیفیت میں جانے والوں کا دُکھ، مزید شدت اختیار کر لیتا۔ آپا بھی بہت بیمار تھیں۔ میں ان کے اور بھائی کے سامنے خود کو مجتمع رکھنے کی کوشش کرتی ورنہ اندر سے میں مسمار ہوئی جاتی تھی۔

علاج ختم ہوا تو میں آہستہ آہستہ زندگی کی طرف لوٹنے لگی، بلکہ موت کو اِتنے

☆ کیموتھراپی اور ریڈیئشن

قریب دیکھنے کے بعد زندگی کی خواہش تیز تر ہوگئی۔

بھائی سے فون پر بات ہوئی تو انھوں نے مجھے اس انتہائی تکلیف دہ علاج کے ختم ہونے پر مبارکباد دی۔ میں نے ان سے پوچھا کہ یہ دوبارہ تو نہیں ہوگا؟ انھوں نے آہستگی سے کہا:

''ہو جاتا ہے۔''

مجھے شدید دھچکا لگا۔ میں نے کہا:

''توبہ ہے بھائی جان، آپ میری تسلی کے لیے ہی کہہ دیتے کہ دوبارہ نہیں ہوگا۔''

انھوں نے جواب دیا۔

''ایک اچھا ڈاکٹر، کبھی غلط بات نہیں کرتا اور ایک 'اچھے' اور پڑھے لکھے مریض کا اس سے باخبر ہونا بہت ضروری ہوتا ہے۔''

(میرا علاج ختم ہوا تو راولپنڈی CMH میں میرے ڈاکٹر صاحب نے ایک جملے میں مجھے بہت بڑا انعام دیا تھا۔

"You are a very good patient."

وجہ صرف یہ تھی کہ میں نے ان کی ہدایات پر پورا پورا عمل کیا تھا۔ وہ میرے رویے اور قوتِ ارادی سے بہت خوش تھے اور مجھے Specimen کے طور پر ہر مریض کے سامنے پیش کرتے تھے کہ میں ایک Difficult Patient نہیں ہوں)

ایک دِن فون پر بات کے دوران، بھائی جان نے مجھ سے پوچھا:

''پھر کچھ لکھا؟''

میں جواب میں خاموشی رہی۔ کلینک سے واپسی پر وہ میرے ہاں آئے تو میں نے ان کے ہاتھ میں ایک کاغذ تھما دیا۔ جسے انھوں نے پڑھا تو فرطِ جذبات سے ان کا گلعذار چہرہ سرخ ہوگیا۔ میرے سر پر پیار سے ہاتھ رکھا اور نم آنکھوں کے ساتھ، خاموشی

سے اُٹھ کر چلے گئے۔

میں نے اس کاغذ پر محمود ثنا کی نظم لکھی تھی:

'مجھے اُڑتے پرندے اچھے لگتے ہیں
مجھے ان کی اُڑانیں
زندگی کے راستوں پر حوصلوں کا درس دیتی ہیں
مرے ہاتھوں نے، حرفوں کے گلابوں کو
انھی سے لکھنا سیکھا ہے
مگر ہجرت زدہ موسم میں
جب کوئی اکیلی کونج کرلاتی ہوئی
نیلے فلک کی وسعتوں میں اپنے کھوئے ساتھیوں کو ڈھونڈتی،
آواز دیتی ہے
مجھے بچھڑے ہوئے سب یاد آتے ہیں
مرے ہاتھوں کی پوریں لفظ لکھنا بھول جاتی ہیں'

اور پھر یوں ہوا کہ ان کی اس motivation نے مجھ سے دو کتابیں لکھوالیں۔۔۔

لیکن کاش یہ والی کتاب میں نہ لکھتی!

OOO

کلّیاں بہہ کے رونا

حسن نثار لکھتے ہیں:

’شاید ہی کبھی انسان ’یکمشت‘ مرتا ہو۔ انسان عموماً آہستہ آہستہ قسطوں میں مرتا ہے۔ جب کوئی اپنا قریبی شخص دفن ہوتا ہے تو انسان کی ذات کا ایک مخصوص حصہ بھی اس کے ساتھ ہی دفن ہو جاتا ہے۔ بعض اوقات تو دور پار کا محض شناسا بھی ملک عدم سدھار جائے تو آپ کی ذات کا کوئی نہ کوئی حصہ اپنے ساتھ لے جاتا ہے۔‘

اسی کیفیت کو میں نے اپنی کتاب ’پھول لاکھوں برس نہیں رہتے‘ میں یوں لکھا ہے:

؎ ’غزالاں تم تو واقف ہو، کہو مجنوں کے مرنے کی
دیوانہ مر گیا آخر کو ویرانے پہ کیا گزری‘

اگر ایک دیوانے کے مرنے سے ویرانے پر کچھ گزرتی ہے تو یہاں تو۔۔۔ یہ کہنا ہی فضول ہے کہ مجھ پر کیا گزر رہی ہے۔

۔۔۔وہ جن کے بغیر جینے کے تصور سے بھی دم الٹتا ہو، ان کے بغیر جی کر دیکھ لیا۔
شاید وہ تہی دامن لوگ، جن کا گھیراؤ محبتوں نے نہیں کر رکھا، اسے نہ سمجھ سکیں۔‘

اپنے گھرانے کی پے درپے اموات سے میں ذہنی طور پر اتنی متاثر ہوئی کہ

Depression کی مریضہ بن گئی۔ میں رو رو کر ان سب کا ذکر بھائی جان سے کرتی تو وہ کہتے:

’’اسے لکھو‘‘

کیا لکھوں؟‘‘

’’یہی سب؟‘‘

ان کی دل پذیر Motivation نے آخر اپنا اثر دکھایا اور میں نے لکھنا شروع کیا۔ ایک واقعہ لکھتی اور فوراً فون کر کے، انہیں سناتی۔ ایک روز میں نے پانچ چھ صفحے لکھے اور انہیں سنانے کے لیے فون کیا۔

’’بھائی جان، آپ فارغ ہیں؟ سناؤں؟‘‘

’’بالکل فارغ ہوں۔۔۔ سناؤ‘‘

میں نے سنانا شروع کیا۔ سناتی رہی اور روتی رہی۔ بھائی جان نے جواب میں بالکل ہوں، ہاں نہ کی تو میں نے پوچھا۔

’’بھائی جان، آپ سن رہے ہیں نا؟‘‘

’’سن رہا ہوں اور میں نے بھی ٹشو پیپر کے ڈبے کی طرف ہاتھ بڑھایا ہے۔‘‘

انہوں نے بھرّائی ہوئی آواز میں جواب دیا۔

؎ وقت خوش خوش کاٹنے کا مشورہ دیتے ہوئے
رو پڑا وہ آپ مجھ کو حوصلہ دیتے ہوئے (ریاض مجید)

OOO

ع دھکھدی رہی تے مچ وی پوسی

بھائی جان کے دھیمے، مسلسل اور پیار بھرے اصرار پر میں نے اپنی پہلی کتاب 'پھول لاکھوں برس نہیں رہتے' کا مسودہ تیار کرلیا اور پھر ہچکچاتے ہوئے ان سے کہا۔

''اب میں اسے سنبھال کر رکھ لیتی ہوں۔''

''کیا مطلب؟''

''مطلب یہ کہ۔۔۔بس''

''نہیں نہیں اسے چھپوانا ہے۔''

''بھائی جان۔۔۔بہت شرمندگی اٹھانا پڑے گی۔''

''کس بات کی؟۔۔۔او بھائی من لو، اسیں ایڈے بھیڑے قاری وی نئیں۔ اینوں چھپواؤ۔ فیر ویکھو ہر پاسے چیکاں پینیدیاں۔''

اور وہی ہوا، جس نے بھی کتاب پڑھی، بے پناہ تعریف کے ساتھ یہ بھی کہا کہ آپ نے بہت رلایا ہے۔ میری بیٹی ان تبصروں کو سن کر مجھ سے کہتی۔

''والدہ، آپ بہت خوش ہوتی ہیں جب لوگ کہتے ہیں ہم بہت روئے۔ میرا خیال ہے کہ آپ کو کتاب کے ساتھ ایک رومال بھی تحفتاً دینا چاہیے تھا۔''

پھر اخبارات ورسائل میں اس پر تبصرے آئے۔ بڑے بڑے لکھنے والوں، جناب مشتاق احمد یوسفی، حمید اختر، حسن نثار، جمیل صدیقی سمیت بہت سوں کے تعریفی کلمات میرے لیے سرمایہ بنے۔ ریڈیو پر بہت جاندار تبصرے ہوئے، تعلیمی بورڈ سے انعام کی حق دار ٹھہری تو ایک روز میں نے بھائی سے کہا۔

''بھائی جان، کتنا مزا آئے، میری کتاب 'قدرت اللہ شہاب کی ماں جی' کی طرح مشہور ہو جائے۔''

انہوں نے جواب دیا۔

''کہاں تو تم اسے چھپوانے پر تیار نہیں تھیں اور کہاں۔۔۔کچھ کم پر بات نہیں ہوگی؟''

پھر مجھے اپنے ساتھ لگا لیا اور کہنے لگے۔

''کتاب آہستہ آہستہ اپنی جگہ بناتی ہے۔۔۔

ے چڑھیا مانگھ، وساکھ وی اوسی
دھکھدی رہی تے مچ وی پوسی''

ooo

میری پہلی کتاب 'پھول لاکھوں برس نہیں رہتے' کا فلیپ جو ڈاکٹر بھائی نے لکھا۔ یہ طے تھا کہ دوسری کتاب کا فلیپ بھی وہی لکھیں گے لیکن اِس سے پہلے ہی وہ ملکِ عدم سدھار گئے۔

معنون کی عرض داشت

اگر کوئی کتاب کسی کے نام کردی جائے تو وہ فلیپ لکھنے نہیں بیٹھ جاتا، منزہ نے آپا سے کہا کتاب آپ کے اور ڈاکٹر بھائی کے نام کی ہے کہنے لگیں ''رہن دے۔ اصغر دے ناں کر دے۔''

اصغر۔۔۔ یعنی بڑے بھائی۔ جنھیں گئے ہوئے بیس برس بیت گئے ہیں۔ زندہ ہوتے تو معنون پر بحث چھڑ جاتی، دو تین دِن یہ بحث چلتی کہ لفظ مُعن۔وَن ہے یا مَع۔نُون فیصلہ ہوتا کہ مُعن۔وَن ہی صحیح ہے مگر مع نُون چلتا ہے اور اچھا لگتا ہے۔ چلنے دو۔

ٹیپ ریکارڈر اور سی ڈی کی ایجاد سے پہلے منزہ گھر بھر کا ٹیپ ریکارڈر تھی۔ کوئی واقعہ، کتنے سال پرانا ہو، اُسے درمیان میں بٹھا کر سن لو۔۔۔ یہ بھی اس گھر کا ایک معمول تھا۔

دیکھنے والے جانتے ہیں، سننے والے پوچھتے ہیں، کہ یہ گھر جو عام گھروں جیسا گھر تھا، اس میں خوشیاں بہت تھیں۔ پھر قدرت نے اس کا اُلٹ دِکھایا۔۔۔ پیار کم نہ ہوا۔ بہت پیار کرنے والے لوگ تھے اور توقع ہے کہ All the World Loves a Lover کے مصداق آپ کو یہ لوگ، یہ دُنیا پسند آئے گی، عام لوگوں کے عام سے، سچے جذبے۔۔۔

منزہ نے یہ تصویر کیسے بنائی، وہی جانتی ہے، ہم آپ نہیں۔

انھیں کیا خبر کس دھنک سے مرے رنگ آئے
انھیں کیا خبر کون سی تتلیوں کے پروں سے
انھیں کیا خبر کون سے حسن سے
کون سی ذات سے، کس خدوخال سے
میں نے کوزوں کے چہرے اُتارے
یہی وہ ندا جس کے پیچھے حُسن نام کا یہ جواں کوزہ گر بھی
پیاپے رواں ہے زماں سے زماں تک۔۔۔
میں ہوں اس کہانی کا ڈاکٹر بھائی

مقبول اختر

OOO

Dr. Maqbool Akhtar
M.B.B.S. (Panjab)
M.C.P.S (Psych.)
Consultant Psychiatrist

ڈاکٹر مقبول اختر
ایم۔بی۔بی۔ایس (پنجاب)
ایم۔سی۔پی۔ایس (سائیکاٹری)
کنسلٹنٹ سائیکاٹرسٹ
ماہرامراض نفسیات

جنوں کی یادداشت

آخر کوئی کتاب کسی کے نام کردی جائے تو وہ ملیے۔ لکھنے میں
بیٹھ جاتا، شنزہ نے آپا سے کہا کتاب آپ کے اور ڈاکٹر بھائی
کے نام کی ہے لکھنے تکلیف نہ دے۔ اصغر کے نام کردے"

اصغر — اپنے بڑے بھائی — جینے کے ہوئے بیس برس بہت
گئے ہیں — زندہ ہوتے تو جنون پر بحث چھڑ جاتی، دو تین
دن یہ بحث چلتی کہ لفظ جُنون۔ جُنوں ہے یا جنّ۔ لوگوں
فیصلہ ہوتا کہ جُنوں۔ وہ بھی صحیح ہے مگر جنوں
چلتا ہے اور اچھا لگتا ہے — چلنے دو۔

ٹیپ ریکارڈر اور سی ڈی کی ایجاد سے پہلے شنزہ گھر کا
ٹیپ ریکارڈر تھی کوئی واقعہ کتنے سال پرانا ہو اُسے درمیان میں بٹھا کر
سن لو — یہ بھی اس گھر کا ایک معمول تھا۔

دیکھنے والے جانتے ہیں، سننے والے پوچھتے ہیں،
اور یہ گھر جو عام گھروں جیسا گھر تھا، اس میں خوشیاں بہت
تھیں — پھر قدرت نے اس کا اُلٹ دکھایا — پیار کم نہ ہوا۔

بہت پیار کرنے والے لوگ تھے اور توقع ہے کہ
ALL THE WORLD LOVES A LOVER
کے مصداق آپ کو یہ لوگ، یہ دنیا پسند آئے گی، عام لوگوں
کے عام سے، سچے جذبے — شنزہ نے یہ تصویر کیسے بنائی،
وہی جانتی ہے، ہم آپ نہیں

انہیں کیا خبر کس دھنک سے مرے رنگ آئے
انہیں کیا خبر کون سی تتلیوں کے پروں سے
انہیں کیا خبر کون سے حسن سے
کون سی ذات سے کس خدوخال سے
میں نے کوزوں کے چہرے اُتارے

یہی وہ ندا جس کے پیچھے حسن نام کا یہ جواں کوزہ گر بھی
پیا پے رواں ہے زماں سے زماں تک...

میں ہوں اس کہانی کا ڈاکٹر بھائی
مقبول اختر

میری پہلی کتاب 'پھول لاکھوں برس نہیں رہتے' سے اقتباسات، جن میں ڈاکٹر بھائی کا ذکر ہے۔

'مواقع'

بڑے بھائی جان اور ڈاکٹر بھائی نہر پر سوئمنگ کے لیے جاتے تو مجھے اور چھوٹے بھائی کو بھی ساتھ لے جاتے۔ میں بہت چھوٹی سی تھی اور نہر کے کنارے بیٹھی گھاس توڑ توڑ کر اس میں ڈالتی جا رہی تھی۔ تھوڑی دیر کے بعد، خود بھی ساتھ ہی جا گری۔ ''غڑاپ'' کی آواز سن کر بھائی جان نے میری تلاش شروع کی۔ اتفاق سے میرا پاؤں ان کے ہاتھ میں آ گیا۔ دوسری بار میں تین چار سال کی رہی ہوں گی۔ ڈاکٹر بھائی مجھے کندھوں پر بیٹھا کر سوئمنگ کر رہے تھے کہ مَیں پانی میں جا گری۔ بہر حال جلد ہی 'دستیاب' ہو گئی۔ امّی کبھی اس کا ذکر کرتیں اور شکر کرتیں تو چھوٹے بھائی، مسمسی شکل بنا کر کہتے۔

''بس۔۔۔ قدرت کے سامنے کس کا زور چلا ہے؟۔۔۔ ورنہ 'مواقع' تو اچھے خاصے تھے۔''

ooo

اِک خواہش ایسی۔۔۔

ایف۔ ایس۔ سی کے رزلٹ نے ڈاکٹر بننے کے میرے خواب کو چکنا چور کر دیا۔ جس میں میری نا اہلی کو تو دخل تھا ہی، کچھ تقدیر نے بھی ساتھ نہ دیا۔ تب سرگودھا بورڈ نیا نیا بنا تھا۔ میرا ایک پرچہ گم ہو گیا۔ بھاگ دوڑ کرنے کے بعد، میڈیکل کالج میں داخلہ کے لیے اپلائی کرنے سے ایک روز پہلے، رزلٹ ملا۔ اوسط نمبر لگنے کی وجہ سے کل نمبر کم ہو گئے اور داخلے کے لیے ایک نمبر کم پڑ گیا۔ یہ عید کے دن تھے۔ عید سے پہلے یہ معلوم ہو گیا تھا لیکن ڈاکٹر بھائی نے بتایا نہیں، کہنے لگے:

''تم اپنی اور ہماری عید غارت کر دیتیں۔''

میں بھی ایسے روئی، جیسے زندگی میں کچھ باقی نہ رہا ہو۔ سبھی نے ڈھارس بندھائی۔ ڈاکٹر بھائی کہنے لگے۔

''میں نے تو تمہارے داخلے کے لیے رقم بھی الگ کر رکھی تھی۔''

میں اور دھائیں دھائیں رونے لگی۔

وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ اور جاب مل جانے کے بعد ڈاکٹر نہ بننے کا صدمہ کم ہو گیا اور اب تو میں سوچتی ہوں، کہ بہتر ہی ہوا کیونکہ اب میری غائب الدّماغی کا یہ عالم ہے

کہ مریض بیت جاتا اور مجھے دوا کا نام یاد نہ آتا، لیکن زندگی کی اندھیری راتوں میں ڈاکٹر بھائی کی محبت بھری بات اب بھی لَو دیتی ہے۔ شاید وہ لوگ اس بات کو نہ سمجھ سکیں جو محبتوں کے قدر دان نہیں۔

ع جز ترے اور کو سمجھاؤں تو سمجھا نہ سکوں

ان حالات میں مَیں شدید احساسِ کمتری کا شکار ہوگئی۔ باہر نکلنا چھوڑ دیا۔ ہر وقت یہ خیال لگا رہتا کہ کوئی پوچھے گا کہ آج کل کیا کر رہی ہو تو کیا جواب دوں گی؟ ایسے میں بڑے بھائی جان نے سنبھالا۔ کہنے لگے۔

''بی۔اے کے امتحان میں کچھ عرصہ باقی ہے، بس کھڑکا دو۔''

اور میں نے واقعتاً تین ماہ اور بیس دن کی تیاری سے اچھا بھلا 'کھڑکا دیا'۔

بی۔اے کا رزلٹ آیا تو ابا جی کی آنکھیں، آنسو لیے ہوئے تھیں۔

''لیجیے۔۔۔آپ تو رو رہے ہیں ابا جی۔۔۔یہ تو خوشی کی بات ہے'' (بچپنا) ابا جی نے کہا۔

''یہ خوشی ہی کے تو آنسو ہیں۔ میں نے ایک ہی خواہش کی تھی زندگی میں کہ میری ساری اولاد گریجوایٹ ہو جائے۔'' پھر خوب ہنسے اور کہنے لگے۔

''جب میں نے یہ خواہش کی تھی، تب گریجوایشن بہت بڑی بات تھی۔ آپ میرے بچوں میں سب سے چھوٹی ہیں آج میری خواہش پوری ہوگئی ہیں۔ میں خوش قسمت ہوں، بہت کم لوگ ہوتے ہیں کہ جو وہ مانگیں، انہیں زندگی میں مل جائے۔''

ooo

''باندری''

خوشیاں تلاش کرنا پڑتی ہیں۔ غم خود سے در آتے ہیں۔ دکھ جگہ جگہ راستہ روکے، کھڑے رہتے ہیں۔ ہم سب یہ بات بخوبی سمجھتے تھے۔ چھوٹی چھوٹی باتوں کو Enjoy کرنا، ہمیں جانتے تھے۔ میں گھر کی داستان گو تھی۔ جب قصّہ خوب عروج پر ہوتا تو ڈاکٹر بھائی پاس پڑی ہوئی کوئی چیز، میری طرف زور سے پھینکتے اور کہتے:

''باندری۔''

محبت کے شیرے میں لتھڑا ہوا یہ لفظ مجھے اور شوخ کر دیتا۔ قہقہے گونجتے اور بات آگے بڑھتی رہتی۔ بڑے بھائی جان کہتے جو فلم ہم سینما میں ایک دن دیکھتے ہیں، وہ گھر میں پندرہ دن چلتی ہے۔ تب میرا حافظہ بھی اکبر کے نورتنوں والا تھا۔ مزاحیہ ڈائیلاگ، میں اسی لب و لہجے میں دُہراتی۔ یہ بات مجھے امّی سے ورثے میں ملی ہے۔ امّی بھی جس کی بات کرتیں، اسی کا لہجہ اختیار کر لیتیں۔

ooo

منحوس ہندسہ

آپا کا ایم۔اے کا رزلٹ تیرہ تاریخ کو آیا۔ آپا خاندان کی پہلی لڑکی تھیں جنہوں نے ایم۔اے کیا تھا۔ سب بہت خوش تھے۔ ابا جی کہنے لگے:

''انگریز کہتے ہیں تیرہ کا ہندسہ منحوس ہے۔ لیکن میرے لیے تو بہت مبارک ہے۔ میری شادی تیرہ تاریخ کو ہوئی۔ ایک بیٹے (ڈاکٹر بھائی) اور ایک بیٹی (میں) کی تاریخ پیدائش تیرہ ہے اور اب بیٹی نے تیرہ تاریخ کو ایم۔اے کیا ہے۔''

OOO

عظمت کے مینار

ٹھیک سے یاد نہیں، سیارہ یا اردو ڈائجسٹ میں ایک سلسلہ 'عظمت کے مینار' آیا کرتا تھا۔ اس میں، ایک بار ابا جی کے بارے میں کسی شخص نے لکھا،

''ایک ڈی۔ایس۔پی، اس نام کے، ملتان میں تعینات تھے۔ وہ میرے ڈیری فارم سے دودھ لیتے تھے۔ ان کا تبادلہ خانیوال ہو گیا۔ میرا بل، جو ان کی طرف واجب الادا تھا، انہوں نے خانیوال سے بذریعہ چیک بھیجا۔ ایسے ایماندار پولیس آفیسر میں نے کم ہی دیکھے ہیں۔''

یہ واقعہ اس شخص نے ابا جی کے ریٹائر ہونے کے بارہ پندرہ سال بعد لکھا تھا۔ میں نے پڑھا تو ابا جی کے پاس لے گئی۔ وہ پڑھ کر جذباتی ہو گئے۔ کہنے لگے،

''بیٹا۔۔۔ باہر تو لوگ میری تعریفیں کرتے ہیں کہ بہت ایماندار آفیسر ہے، لیکن سب، آپ کی والدہ کی وجہ سے ہے۔ نہ انہوں نے مجھ سے بے جا فرمائشیں کیں نہ میں غلط کاموں پر مجبور ہوا۔ جیسے بھی ہوا تنخواہ میں گزارہ کیا۔ کبھی کوئی خواتین گھر میں آتیں اور 'بیگم صاحبہ' کو پوچھتیں تو آپ کی والدہ کو دیکھ کر حیران رہ جاتیں۔ جو سادہ ترین لباس میں گھر کے کاموں میں مصروف ہوتیں۔''

کسی بیوی کی، اس کا شوہر اس سے زیادہ کیا تعریف کر سکتا ہے؟

گھر کے کاموں میں، یوں تو امّی کے مددگار کافی ہوتے تھے۔ سستا زمانہ تھا۔ سرکاری افسر ہونے کی وجہ سے ابا جی کو اردلی بھی ملا ہوا تھا لیکن وہ کبھی گھر کے اندر نہیں آتا تھا۔ امّی پردہ کرتی تھیں۔ بہشتی کے آنے پر بھی وہ کمرے میں چلی جاتی تھیں۔ صفائی کے لیے عام طور پر کوئی عورت آتی تھی لیکن کچن کے کام میں مَیں نے نہیں دیکھا کہ جب تک وہ صحت مند رہیں انہوں نے کسی کی مدد لی ہو۔ گھر میں مہمانداری بھی بہت تھی۔ وہ خوشدلی سے سارے کام کرتیں۔ دودھ بلونے سے لے کر چپاتی بنانے تک۔ اللہ تعالیٰ نے ان کے ہاتھ میں ذائقہ بھی بہت دیا تھا۔ کِس کِس چیز کا نام لوں۔ پلاؤ۔۔۔ کوفتے۔۔۔ ساگ۔۔۔ اور مکئی کی روٹی۔۔۔ پیار میں گندھے ہوئے مکھن میں کچوڑ☆ پراٹھے۔۔۔ ابھی تک میرے ہاتھوں سے ان کی مہک آتی ہے۔ ان کے آخری ایام میں ڈاکٹر بھائی نے ان کو بہلانے کے خیال سے کہا،

''امّی۔۔۔ کسی دن انڈوں کی بھجیا تو بنا کر کھلائیں۔''

اس پر وہ رو پڑیں۔ کہنے لگیں:

''بیٹا۔۔۔ اب تو میرے ہاتھوں میں طاقت نہیں۔۔۔ کیا کروں؟''

لیکن پھر حسبِ عادت انکار نہ کر سکیں۔ کہنے لگیں:

''اچھا میں پاس بیٹھ جاؤں گی۔۔۔ چمچہ تمہاری بہن ہلاتی جائے گی۔''

لیکن اس کا موقع نہ آیا۔

امّی نے جتنے پیار سے کھانے بنائے۔۔۔ اتنے ہی ابا جی ان کے معترف تھے۔ اس مقولے کے مطابق کہ

''کھانا بنانے پر صرف کیا جانے والا پیار، کبھی ضائع نہیں جاتا۔''

شاید امّی کی محبت ان کھانوں کو لذیذ بنا دیتی تھی۔ میں نے اکثر عورتوں کو جلتے

☆ یہ لفظ میری ذاتی لغت سے ہے بمعنی گندھے ہوئے۔

کڑھتے، بیزاری سے کھانا بناتے دیکھا ہے۔ شاید تبھی ان کے کھانوں کی خوشبو اُڑ جاتی ہے۔

ریٹائرمنٹ کے بعد، کبھی کبھار ابا جی بھی امّی کے کاموں میں ان کی مدد کروا دیتے تھے۔ ایک بار امی کپڑے دھو رہی تھیں۔ انہوں نے کپڑے نچوڑ کر بالٹی بھری اور خود کسی کام سے اندر چلی گئیں۔ واپس آئیں تو الگنی کپڑوں سے بھری دیکھ کر حیران ہوئیں۔ اتنے میں ابا جی ہنستے ہوئے آ گئے۔

''وہ کپڑے میں نے پھیلا دیے ہیں۔''

امّی کہنے لگیں:

''نا بابا۔۔۔ لوگ کہیں گے ریٹائر ہو کر یہ کام کرنے لگے ہیں۔''

بھابھی نے یہ دیکھ کر کہا:

''ابا جی آپ تو امّی کی مدد کرتے ہیں۔ اپنے بیٹے سے بھی کہیں، کبھی میری مدد کر دیا کریں۔''

ابا جی نے کہا:

''بیٹا۔۔۔ پہلے آپ اپنی ساس جتنا کام کر کے دکھائیں۔ اگر پھر میرے بیٹے نے آپ کی مدد نہیں کی تو میں اس سے کہہ دوں گا۔''

الیکٹرک ٹرالی اور مائیکرو ویو اوون تو آج کی بات ہیں لیکن میری ماں کے پاس تو اس زمانے میں بھی شاید یہ سب کچھ تھا۔ یاد نہیں کبھی ٹھنڈا کھانا، ملا ہو۔ جیسے ہی کوئی بچّہ گھر آتا، توا رکھ کے ساتھ ساتھ گرم روٹی اُتارتیں۔

آج کل تو میڈیا کی بدولت کھانے کی ترکیبیں ہوا میں تیرتی پھرتی ہیں۔ امّی کے کھانوں میں تو تب بھی بہت تنوع تھا۔ کبھی ابا جی سے پوچھتیں کہ آج کیا پکائیں تو وہ ایک عجیب سا جوڑ میل بتا دیتے۔ امّی کہتیں:

''لیں بھلا۔۔۔ یہ بھی کبھی پکتا ہے؟''

ابا جی ہنستے ہوئے کہتے:

''دیکھئے۔۔۔ یہ سب انسان کا ہی تو بنایا ہوا ہے، کوئی آسمانی صحیفہ تو ہے نہیں۔''

کھانا بنانے میں جو محنت درکار ہوتی ہے امّی نے اس میں کبھی خسّت سے کام نہیں لیا تھا، وہ رات کو دودھ گرم کرتیں اور اسے پھینٹ پھینٹ کرا تنا ٹھنڈا کرتیں کہ وہ جمانے کے قابل ہو جائے۔ پھر اسے گجراتی مٹی کے بڑے سے پیالے میں دہی بنانے کے لئے ڈال دیتیں۔ بے حد مزے کا دہی تیار ہوتا۔ بڑے بھائی جان کے ایک دوست کہتے،

''اس پیالے میں تو چھ ماہ کے بچّے کو با آسانی نہلایا جا سکتا ہے۔''

ooo

سری لنکا کے نقشے اور بغیر ہلدی کا سالن

ایف۔ ایس۔ سی کے بعد تک امّی اور آپا نے مجھے گھر کے کام کو ہاتھ تک نہ لگانے دیا۔ ابا جی کبھی دبی زبان میں کہتے بھی کہ کام کرنا آنا چاہیے۔ ضروری نہیں کہ کیا بھی جائے۔ تو امّی کہتیں:

''عمر پڑی ہے کام کرنے کو۔''

جن دنوں میں بی۔ اے کی تیاری کر رہی تھی امّی کا بازو ٹوٹ گیا۔ آپا کی شادی ہو چکی تھی۔ میں نے گھر کا کام کرنا شروع کیا۔ عجیب تماشے کرتی۔ لیکن مجال ہے جو کسی نے مذاق اُڑایا ہو۔ ٹیڑھی میڑھی لیکن بہت پتلی روٹیاں بناتی تو ابا جی کہتے:

''اگر میں نے دو روٹیاں کھانا ہوں تو اڑھائی کھاتا ہوں۔''

چھوٹے بھائی کہتے:

''ویسے آپس کی بات ہے۔۔۔ یہ سری لنکا کے نقشے ہیں مزے کے۔''

بغیر ہلدی کا سالن کھا کر، ڈاکٹر بھائی اتنا سراہتے کہ میں نے گھر کے کاموں میں دلچسپی لینا شروع کر دی۔ آپا میکے آتیں اور مجھے بھاگ بھاگ کر کام کرتے دیکھتیں تو ان کا دل برا ہو جاتا۔ میں ان کے گلے میں جھول جاتی۔

''آپا۔۔۔ بڑا مزہ آتا ہے کام کرنے میں۔۔۔ سب اتنی تعریفیں جو کرتے ہیں۔''

Biggy Biggy اور Teeny Tiny

چھوٹے بھائی سے دوستی برابری والی تھی۔ بڑے بھائی جان اور ڈاکٹر بھائی سے بے تکلفی بہت تھی لیکن ذرا مختلف انداز لیے ہوئے تھی۔ بڑے بھائی جان پڑھاتے تو ڈکشنری مجھے نہ دیکھنا پڑتی۔ وہ مجھے بانسری کی لے پر 'سارے گاماپا' سکھاتے، ہم لفظوں کو اُلٹ پلٹ بولتے، چٹکیوں اور دھپّوں کی صورت میں ایک دوسرے کے لیے سزائیں مقرر کرتے۔ وہ بازوؤں سے پکڑ کر مجھے 'میری گوراؤنڈ' بنا دیتے۔

ڈاکٹر بھائی، ہمیشہ نظر رکھتے کہ کہیں میں سلیپر تو نہیں گھسیٹتی پھر رہی۔ بوٹ جرابیں پہنے ہوئے ہوں۔ بالوں میں خوش رنگ ربن بندھا ہے۔ کلرنگ بک میں جس صفحے میں رنگ بھرے ہیں اس کے برابر والی Poem یاد کی ہے یا نہیں؟ اس لیے میں انہیں بچوں کے لیے ایک کہانی کے کرداروں کے ناموں سے پکارتی بڑے بھائی جان Teeny Tiny اور ڈاکٹر بھائی جان Biggy Biggy۔ اور جب میں انہیں ہوسٹل میں خط لکھتی تو یہی القاب لکھتی۔

اپنے کالج کے زمانے میں بھائی جان انڈیا سے ہندی رسالہ 'پراگ' منگواتے تھے، اس سے انہوں نے ہندی لکھنا سیکھی۔ مجھے بھی اپنا نام، ہندی رسم الخط میں لکھنا آ گیا۔ ایک

دن ہمارے ایک ددھیالی عزیز آئے تو میں نے بڑے فخر سے انہیں لکھ کر دکھایا، وہ کہنے لگے:

''چھی چھی۔۔۔ ہندوؤں کی زبان۔۔۔''

ابّا جی نے سنا تو کہنے لگے:

''اس میں کیا حرج ہے۔ دوسری زبانیں سیکھنی چاہئیں۔''

بڑے بھائی جان مجھے خط لکھتے:

''تمھارے پتر کا اُتر دے رہا ہوں آشا ہے تم کُشل ہو گی۔''

OOO

خلیج

ابا جی ریٹائر ہوئے تو میری اور چھوٹے بھائی کی تعلیم ابھی مکمل نہیں ہوئی تھی۔ آپا اور بڑے بھائیوں کی شادی بھی نہیں ہوئی تھی اور ہمارا اپنا کوئی گھر بھی نہیں تھا۔ ظاہر ہے ابّا جی کی تنخواہ میں سب تعلیم حاصل کر رہے تھے، یہی بڑی بات تھی۔ ڈاکٹر بھائی نے ان حالات کو دیکھتے ہوئے خلیج کے ایک ملک میں سروس کر لی۔ جس سے گھر میں فراوانی تو بہت ہوگئی لیکن ہم سب ان کی کمی کو بہت محسوس کرتے۔ انہوں نے بھی اپنا Contract پورا نہ کیا اور جلد واپس آ گئے۔ وہ گھر کے لیے اور چیزوں کے علاوہ فریج لے آئے جو اس زمانے میں بہت عام نہیں تھا۔

میں نے اور چھوٹے بھائی نے فریج Un pack کیا، صاف کیا اور امّی کو بٹن دبا کر افتتاح کرنے کو کہا، سب نے تالیاں بجائیں۔ امّی ایک ایک چیز اس میں رکھتیں اور شکر شکر کرتیں۔

فوٹو گرافی، میرے سوا سب بہن بھائیوں کا شوق تھا۔ ہمارے پاس بہت اچھا کیمرہ نہیں تھا، لیکن بڑے بھائی جان نے اس سے بہت عمدہ تصویریں بنائیں۔ انہیں Develop بھی وہ خود ہی کرتے تھے۔ آپا نے پنجاب یونیورسٹی کے فوٹو گرافی کے مقابلے میں اوّل

انعام بھی حاصل کیا تھا۔

جب ڈاکٹر بھائی باہر گئے تو بڑا اچھا کیمرہ انلارجر، اور فوٹو گرافی کا دیگر سامان لے کر آئے۔ گھر میں ایک ڈارک روم بنایا گیا تھا۔ بھائی جان پورٹریٹ بناتے، اسے انلارج کرتے اور یوں ان کے شوق کو بڑھاوا ملا۔

ooo

Independent

ابا جی ہمیشہ پارکر کا پین استعمال کرتے۔ میرا خیال ہے اپنی ذات پر کیا جانے والا، یہ ان کا واحد بڑا خرچ تھا۔ اس کے لیے بھی وہ ہمیشہ معذرت خواہ نظر آتے۔ کہتے،

"میں بہت دبا کر لکھتا ہوں اور کوئی دوسرا پین اس کا متحمّل نہیں ہوتا۔"

پین کو وہ ہمیشہ Independent کہتے۔ ڈاکٹر بھائی باہر گئے تو ان کے لیے زیادہ قیمتی پارکر پین لے کر آئے۔ اسے وہ بہت سنبھال کر رکھتے۔ پھر کسی ایک دن وہ اچانک 'انکشاف' کرتے کہ ان کا پین کھو چکا ہے۔ سارا گھر اس کو تلاش کرنے میں مصروف ہو جاتا۔ کچھ دیر بعد وہ مسکراتے ہوئے چلے آتے۔

"لو بھئی۔۔۔ وہ تو میری جیب میں لگا ہے۔ میں نے سوئیٹر پہن رکھا تھا پتا ہی نہیں چلا۔"

سب سکھ کا سانس لیتے۔ امی کہتیں،

"پین اور وہ بھی بیٹے کا لایا ہوا۔۔۔ خدا کے لیے اسے سنبھال کر رکھا کریں۔ آپ تو مجھے پریشان کر دیتے ہیں۔"

ooo

حُسن پری

بڑے بھائی جان کیمرے سے بڑے اچھے پورٹریٹ بناتے تھے۔ کبھی وہ مجھے کہتے کہ آؤ تمہاری تصویر بناؤں اور میرا موڈ نہ ہوتا تو میں کہتی،

"نا۔۔۔ بابا۔۔۔ مجھے تصویر نہیں بنوانی۔۔۔ میری تصویر اچھی نہیں آتی۔۔۔"

تو چھوٹے بھائی، جھٹ سے میرے سر پر ہاتھ رکھ کر گلوگیر آواز میں کہتے۔

"صبر کرو میری عزیز بہن۔۔۔ یہ مسلّمہ حقیقت ہے کہ تصویر ویسی ہی بنتی ہے، جیسی شکل ہو۔"

اور میں اپنا موڈ بھول کر کیمرے کے سامنے جا بیٹھی۔

"میں تصویر بنوانے لگی ہوں۔۔۔ اور آپ دیکھ لیجیے گا۔ کتنی اچھی آتی ہے۔۔۔ ہاں۔"

ایک بار میں نے چھوٹے بھائی کی تصویر بنائی اور انہوں نے میری۔ اتفاق سے دونوں بہت اچھی بنیں۔ میں ہر ایک کو دکھاتی اور بھائی کی تصویر کی طرف اشارہ کر کے کہتی:

"یہ تصویر کھینچنے والے کا کمال ہے۔"

اور پھر اپنی تصویر کی طرف دیکھ کر کہتی:

"یہ تصویر کھنچوانے والے کا۔"

بھائی جواب میں ایک لمبی سی 'ہوں' کرتے۔

ابّا جی کے ریٹائر ہونے پر ہمارا اپنا گھر نہیں تھا۔ ڈاکٹر بھائی نے خلیج کے ایک ملک میں سروس جوائن کر لی تو گھر بنانے کا سوچا گیا۔ ہماری زرعی زمین بھی شہر کے نزدیک تھی، وہیں پر، چھ کنال کے قطعہ پر گھر بنایا۔ اس کے اندر نہری پانی کا ایک نالہ تھا، جس سے گھر سے ملحقہ باغ میں پانی دیا جاتا۔

ایک دن میں نے کہا:

''افسوس کہ پانی 'شفّاف' نہیں ہے ورنہ میں اپنے 'مرمریں پاؤں' اس میں لٹکا کر بیٹھا کرتی۔''

چھوٹے بھائی جھٹ سے بولے:

''جیسے تمہارے پاؤں 'مرمریں' ہیں ویسا 'شفّاف' تو یہ ہے۔''

ooo

ہارٹ اٹیک

۵ جنوری ۱۹۷۴ء کی سرد رات۔۔۔ سہمی ہوئی فضا۔۔۔ مکمّل خاموشی۔۔۔ سب یوں دبے پاؤں چل پھر رہے تھے، جیسے سائے ہوں۔۔۔ ایک دوسرے کو سوالیہ نظروں سے تکتے ہوئے۔۔۔ بڑے بھائی جان کو دل کا دورہ پڑا تھا۔ ان کے کمرے میں ڈاکٹر بھائی اور ان کے ایک ڈاکٹر دوست موجود تھے۔

بھائی جان کو آکسیجن دی جا رہی تھی۔ ان کے ماتھے پر ٹھنڈے پسینے کی بوندیں، ٹپک رہی تھیں۔ وہ زندگی اور موت کے دوراہے پر کھڑے تھے اور ساتھ کے کمرے میں امّی ابا جی بیٹھے تھے۔ وہ سراپا دعا تھے۔ ذرا سی آہٹ سے، وہ یوں دہل جاتے کہ اب نہ جانے کیا سننے کو ملے گا؟ آپا ان کو سنبھالنے میں لگی ہوئی تھیں۔ میں اور چھوٹے بھائی ٹھنڈے فرش پر، ننگے پاؤں چھوٹے موٹے کام کرتے پھر رہے تھے۔ صورتِ حال کی سنگینی، میرے منہ سے سسکی کی صورت میں نکلتی تو، چھوٹے بھائی میری طرف دیکھ کر، منہ پر انگلی رکھ کر مجھے خاموش ہونے کو کہتے۔ ایسے میں ان کی بڑی بڑی آنکھیں، سرخ ہو جاتیں۔ رات اسی بیم و رجا میں کٹی۔ صبح بھائی جان کی طبیعت قدرے سنبھلی لیکن ۷۲ گھنٹے تلوار سر پر لٹکتی رہی۔

وہ آہستہ آہستہ بہتر ہونے لگے امّی۔ ابّا جی کی دعائیں اور ڈاکٹر بھائی کی شبانہ روز

محنت رنگ لائی۔ڈاکٹر بھائی نے دو ماہ اپنے کلینک کا رُخ نہیں کیا۔ان کے ڈاکٹر دوست بھی پہلے ۳۶ گھنٹے ہمارے گھر پر رہے اور پھر باقاعدگی سے روزانہ آتے رہے (آج کسی ڈاکٹر کو بتایا جائے تو شاید وہ یقین نہ کرے لیکن ہمارے معاملات کچھ ایسے ہی ہیں۔زندگی میں روپے پیسے کو اتنی ہی اہمیت دی، جتنی کہ دی جانی چاہیے۔محبتوں کو کبھی اس کے برابر نہیں تولا۔)

اس کے ٹھیک دس ماہ بعد امّی کو بھی ہارٹ اٹیک ہوا۔جس کے لیے وہ کہتیں،

''یہ بیماری میں نے مانگ کر لی ہے۔''

اس کے جواب میں، ابّا جی اکبر بادشاہ کے اپنے بیٹے کے لیے سات پھیروں کی کہانی سناتے۔

اور پھر اس کے دس سال بعد بڑے بھائی جان اور امّی، اسی طرح پانچ ماہ بیس دن کے وقفے سے، اس دنیا سے رخصت ہو گئے۔

ے پیڑے نی پیڑے
ایہہ پیار ایسی تتلی ہے
جیہڑی سدا سُول تے بہوے

(شوکمار بٹالوی)

ooo

عالمِ ہستی کی ویرانی

۱۸راگست ۱۹۸۱ء---پورنماشی کی رات---ایک بجے کا عمل---ہر چیز نے اندنی کی سفید چادر اوڑھ رکھی تھی۔میں امّی کے پاس گہری نیند سو رہی تھی کہ ایک کار آکر ری۔ڈرائیونگ سیٹ سے نکلنے والے نے دروازہ کھلا ہی رہنے دیا۔کار کی بتّیاں، اسی طرح ل رہی تھیں۔ابّا جی باہر والے برآمدے میں سو رہے تھے۔آنے والے ڈاکٹر بھائی تھے۔وہ ابا جی کے پاس دوزانو ہو گئے اور سر اِن کے سینے پر رکھ دیا۔ابا جی کی آنکھ کھلی تو انہوں نے ان نظروں سے دیکھا، پھر ایک دم گھبرا کر اُٹھ گئے۔

''بیٹا کیا بات ہے؟ خیریت تو ہے؟''

ڈاکٹر بھائی نے جواب دیا!

''نہیں ابا جی، خیریت ہی تو نہیں ہے۔''

''اللہ رحم کرے۔''

''ابا جی---صفدر (چھوٹے بھائی)---چلا گیا۔''

''اِنا للہ---''

آپا اور بھابھی جاگ رہی تھیں۔انہیں بھی پتا چل گیا، کیونکہ تھوڑی ہی دیر پہلے، تو

چھوٹے بھائی کی طبیعت خراب ہو جانے پر، بڑے بھائی جان انہیں ڈاکٹر بھائی کے پاس لے گئے تھے۔ مجھے جگا کر ڈاکٹر بھائی باہر لے آئے اور کہا:

''صفدر چلا گیا۔''

میں گہری نیند میں تھی اور یوں بھی یہ بات میرے وہم و گمان میں بھی نہ تھی۔

''ڈاکٹر بھائی۔۔۔ کہاں؟''

ڈاکٹر بھائی کے پاس، اس کا جو جواب تھا، وہ ہمارے خاندان کی تباہی کا آغاز تھا۔

اب امّی کو بتانا باقی تھا، جو دوا کے زیرِ اثر سو رہی تھیں۔ ڈاکٹر بھائی کے ڈاکٹر دوست ساتھ آئے تھے۔ امّی کو جگا کر، ڈاکٹر صاحب انہیں انجکشن دینے لگے تو امّی نے پوچھا۔

''مجھے انجکشن کیوں دے رہے ہیں؟''

ڈاکٹر صاحب کے پاس آپا کھڑی تھیں، انہوں نے کہا،

''امّی۔۔۔ صفدر بیمار ہے۔''

امّی کہنے لگیں!

''ڈاکٹر صاحب۔۔۔ بیٹا۔۔۔ اسے دوا دیں۔۔۔ مجھے انجکشن کیوں دے رہے ہیں؟''

تھوڑی دیر کے بعد ایمبولینس آ گئی۔ بڑے بھائی جان آگے بیٹھے تھے اور پیچھے۔۔۔

چھوٹے بھائی کو دو ماہ میں تیسرا ہارٹ اٹیک ہوا، جو جان لیوا ثابت ہوا۔ دُنیا سے رخصت ہونے کے بعد بھی، ان کے چہرے پر وہی مسکراہٹ منجمد تھی، جو ان کی شخصیت کا خاصہ تھی۔ گھر میں کون زیادہ دکھی تھا؟۔۔۔ اندازہ لگانا مشکل تھا۔

اس سانحے سے، ہمارے گھر کا نقشہ بدل گیا۔ خوشیوں کی جگہ، دکھ بھر گئے۔ قہقہوں نے سسکیوں کا روپ، دھارن کر لیا۔ وہ دن اور آج کا دن، عالمِ ہستی کی ویرانی نہیں جاتی۔

☆ بہار راچہ می کنم چو شد ز بر بہارِ من

☆ میں بہار کا کیا کروں جب میری بہار مجھ سے جدا ہو گئی۔

شہرِ خموشاں آباد ہو گیا

گھر سے ملحقہ زمین میں، چھوٹے بھائی کی قبر بنانے کو ابا جی نے ہی کہا تھا۔ عزیزوں نے سمجھانے کی ہر ممکن کوشش کی کہ قبر اتنی نزدیک نہ بنائی جائے، لیکن ابا جی دکھ کی جس کیفیت میں سے گزر رہے تھے، انہیں منانا، ناممکن تھا۔ انہیں قائل کرنے کو کہا کہ اکیلی قبر نہیں بنانا چاہیے۔ انہوں نے جواب دیا،

''آپ لوگوں کا کیا خیال ہے یہ اکیلی رہ جائے گی؟''

اور پھر سب سے پہلے چھوٹے بھائی کے پہلو میں، جا آباد ہوئے۔ اڑھائی سال کے اندر اندر بڑے بھائی جان اور امّی بھی وہیں جا سوئے، اور وہاں ایک الگ شہرِ خموشاں آباد ہو گیا۔

چھوٹے بھائی اور ابا جی کے جانے سے، گھر کے دو کمانے والے جاتے رہے تو ڈاکٹر بھائی کو فکرِ معاش نے، زیادہ مصروف کر دیا۔ ساتھ میں امّی کی بیماری۔۔۔ بڑے بھائی جان بھی دِل کے مریض تھے۔

بڑے بھائی جان نے گھر کے دیگر معاملات سنبھال لیے۔ امّی کی طبیعت دن میں کئی کئی بار خراب ہوتی، بڑے بھائی جان ہمہ وقت ان کے ساتھ رہتے۔۔۔ دکھ، پریشانیاں

---مسائل۔

ابّا جی کی وفات کے دوسال بعد جب گھریلو زندگی قدرے معمول پر آنے لگی تو امّی بھی تمام تر پریشانیوں کے باوجود کہتیں۔

''خدا سب کے ساتھ مجھے بھی زندگی دے---اتنی کہ بِن باپ کے بچّے، ذرا بڑے ہو جائیں۔''

کہ بڑے بھائی جان بھی رات کو سوتے سوتے میں، گزر گئے۔ ان کی ڈائری میں یہ شعر لکھا ہوا ملا۔

تھک کر یونہی دم بھر کے لیے آنکھ لگی تھی
سو کر ہی نہ اُٹھیں، یہ ارادہ تو نہیں تھا

دکھ کی اگر کوئی شکل ہوتی ہے تو وہ میری ماں سے مشابہت رکھتی تھی۔ وہ رضائی میں منہ چھپا کر روتیں اور پھر منہ صاف کر کے کہتیں:

''آج سردی بہت ہے رضائی گرم ہی نہیں ہو رہی۔''

ایک دن امّی نے ایسے ہی رضائی منہ سے اُتار کر مجھ سے کہا:

''بیٹا---مجھے اصغر (بڑے بھائی جان) کا تمہارے باپ جیسا آسرا تھا۔''

ہمارے معاشرے میں عورت کے لیے شوہر اور بڑا بیٹا کیا حیثیت رکھتے ہیں، اس ایک جملے سے اس کی وضاحت ہو جاتی ہے۔

OOO

ترا کیا اصول ہے زندگی

امّی کی زندگی کے آخری چند دن پہلے میں میکے پہنچی تو امّی نے کہا۔

''بچیئے---چنگا ہویا تو آ گئی۔''

میں حسبِ عادت، ان کے ساتھ لیٹ گئی۔ ان کا دل مفلوج ہو رہا تھا۔ دو بیٹوں، خاوند اور بھائی (چھوٹے بھائی کی وفات کے سات ماہ بعد میرے بڑے ماموں بھی وفات پا گئے تھے) کی پے در پے اموات کو انہوں نے کیسے برداشت کیا---مجھے آج بھی سکون کی نیند سونے نہیں دیتا۔ انہیں انجائنا کی درد ہوتی تو ہم---ان کی بچی کھچی اولاد، ان کے گرد اکٹھے ہو جاتے تو وہ کہتیں۔

''مجھے کچھ نہیں ہوگا---میں بہت ڈھیٹ ماں ہوں۔''

نہ جینا اپنے بس میں ہے نہ مرنا۔
چین اک پل نہیں---اور کوئی حل نہیں---

اور پھر ایسے ہی ایک دن، انہوں نے باری باری، سب کو اپنے پاس بلایا، گلے سے لگایا، پیار کیا اور کہا۔

''میں بھی اللہ کی سپرد اور آپ بھی اللہ کی سپرد۔''

آخر میں ڈاکٹر بھائی سے کہا:

''بیٹا، تم نے میری بہت خدمت کی ہے۔''

انہوں نے بیٹے کے لیے زندگی میں جنّت کی سفارش کی۔ ماں سے بڑھ کر اور کون گواہی دے سکتا ہے؟

چپکے سے آنکھیں بند کیں اور پھر کبھی نہ کھولیں۔ وہ پانچ دن 'کوما' میں رہیں۔ مجھے یہ سوچ کر پسینہ آجاتا کہ اگر امّی کو کچھ ہو گیا تو؟۔۔۔اور وہ لمحہ، جب وہ مشتِ غبار، رزقِ خاک ہوئی، میری حیات کے سارے سفر پر بھاری ہے اور میں آج بھی ان سے بچھڑ کر زندہ ہوں۔ ہنستی ہوں۔۔۔کھاتی پیتی ہوں۔۔۔پہنتی اوڑھتی ہوں۔۔۔مالک۔۔۔یہ کیا ہے؟

ترا کیا اصول ہے زندگی؟
مجھے کون اس کا جواب دے

(امجد اسلام امجد)

ooo

چشمِ سُرمہ سا

امّی کے بال بہت لمبے اور خوبصورت تھے۔ مجھے ان سے کھیلنا بہت اچھا لگتا۔ میں انہیں کھولتی، باندھتی، پھیلا دیتی۔ انہیں جھنجلاہٹ ہوتی، لیکن کبھی منع نہ کرتیں۔

بچپن کی یادوں میں، امّی کی روشن آنکھیں دمکتی دکھائی دیتی ہیں۔ امّی کبھی کبھار سرمہ لگاتیں تو ان کی بڑی بڑی آنکھیں اور خوبصورت لگنے لگتیں۔ ابا جی دیکھتے تو کہتے۔

''او۔۔۔ربّ جی''

یہ تعریف کرنے کا، ان کا اپنا انداز تھا۔

امّی کو غسل دیا گیا تو ان کے چہرے پر سرمہ لگی آنکھیں، سب سے نمایاں تھیں۔

ان کو دفن کرنے کی اگلی صبح، میری طبیعت بہت گھبرائی ہوئی تھی۔ آپا قرآن پاک پڑھ رہی تھیں۔ میں ڈاکٹر بھائی کو تلاش کرتے باہر نکلی تو وہ امّی کی قبر کے پاس بنچ پر اکیلے بیٹھے تھے۔ مجھے گلے سے لگا لیا اور آہستگی سے کہا۔

''امّی کی آنکھوں میں سرمہ کس نے لگایا تھا؟''

ooo

رفتگاں کی یاد

میری پہلی کتاب ''پھول لاکھوں برس نہیں رہتے'' کی تقریبِ رُونمائی 24 دسمبر 2008ء کو نصرت فتح علی خان آڈیٹوریم، پاکستان آرٹس کونسل فیصل آباد میں منعقد ہوئی۔ اس میں ڈاکٹر بھائی جان نے میری کتاب کے بارے میں درج ذیل مضمون پڑھا۔ پڑھتے ہوئے، بار باران کی آواز بھرّا جاتی اور ضبط کی کوشش میں چہرہ گلگلوں ہو جاتا۔

لیکن جب میری دوسری کتاب کی تقریبِ رونمائی 24 فروری 2011 کو اسی ہال میں ہوئی تو انہیں گزرے ہوئے چھ ماہ کا عرصہ ہو چکا تھا جہاں ان کا ذکر کرتے ہوئے میں اپنے جذبات پر قابو نہ رکھ سکی۔

رفتگاں کی یاد

ایک درماندہ رہرو کی صدائے دردناک۔۔۔ ایک بزرگ، اپنے برخوردار کو سمجھا رہے تھے۔

''بچہ! لوگوں کے جنازے میں جایا کرو ورنہ جن لوگوں کے جنازے میں تم نہ گئے، وہ بھی تمہارے جنازے میں شریک نہیں ہوں گے۔''

آج کی محفل، حضرات۔۔۔ شرکت فرما کر ثوابِ دارین حاصل کریں، کی دعوت

نہیں ہے۔ یہ تو دعوتِ عام ہے، ان دلوں کے لیے جو دھڑکنا جانتے ہیں۔ ان ذہنوں کے لیے، جو ان یادوں کے ممنون ہیں جو انسانی وجود کا سب سے اہم حصہ ہیں، جنہیں گم کر کے لوگ باگ خود بھٹک جاتے ہیں کیونکہ وہ جو رگِ جاں سے قریب تر تھے، جاتے تو ہیں پر آپ کو چھوڑ کر نہیں جاتے۔ اگر آپ جاگتے میں ان کی یاد سے پیچھا چھڑا لیتے ہیں تو وہ خوابوں میں آجھانکتے ہیں۔ علامہ نے فرمایا تھا:

؎ میری تمام سرگذشت
کھوئے ہوؤں کی جستجو

جستجو کس لیے؟۔۔۔ یہ تلاش ہے اپنی اصلیت کی، اپنی جڑوں کی۔۔۔ جنہیں بھول کر لوگ دنیاداری میں، پیسہ کمانے میں جُت جاتے ہیں اور خوب کماتے ہیں اور پھر حیران بھی ہوتے ہیں کہ خوشیاں کیوں نہیں ملیں؟ اس کے لیے الگ سے ہر جمعرات کو داتا صاحب حاضری دینا پڑتی ہے۔

یادیں تو زبردستی آتی ہیں، آپ کو اسیر کر لیتی ہیں لیکن اگر آپ خود سے ان یادوں کے متلاشی ہوں، ان کی چاہت کریں تو اسے کیا کہیں گے؟ اس کے لیے اردو زبان کا لفظ موجود ہے اگرچہ استعمال کم ہوتا ہے۔۔۔ للک بمعنی Yearning یا علامہ کے الفاظ میں دردوسوزِ آرزومندی۔۔۔ جو اک متاعِ بےبہا ہے۔

للک ایک بنیادی، لازمی اور طاقت ور جذبہ ہے، للک کسی دوسرے میں ضم ہونے سے پسپائی کی تاریخ ہے، للک گئے ہوؤں کا مرثیہ ہے، اک ہوک ہے۔۔۔ جدائی کے لیے اپنی ذات سے جدا ہو جانے والے ایک حصے کا ماتم، وہ حصہ جو جانے والوں کے ساتھ چلا گیا۔

للک ہے ماضی سے چمٹنے کا نام، ماضی کو اچھی طرح نچوڑنے کا تا آنکہ اپنی ذات کے تمام ذرے اس میں سے بازیافت کر لیے جائیں۔

ے بچھڑے ہوؤں کے ساتھ گیا جو
ماتم ذات کے اس حصے کا

للک ہے ماضی، للک حال بھی، للک ہمارا مستقبل ہے۔

ساری بھوکیں، ساری پیاسیں
یہ بھی للک ہے
تیز اور تیکھی
بنیادی بھی
خواہش، جذبے، چاہت، سپنے
للک پتا ہے، للک ہے ماتا
للک گئی کل سے لوٹانا
اپنی ذات کے کھوئے ذرے
تو صاحبو!

ہوا یوں۔۔۔ خدا کسی کے ساتھ ایسا دوبارہ نہ کرے۔۔۔ کہ ہمارے والدین اور دو جوان بھائی، یکے بعد دیگرے، تین سال کے عرصہ میں، ہم سے الگ ہوئے۔ اتنا وقت بھی نہ ملتا تھا کہ ایک کی یاد سے انصاف کرلیں دوسرا اچل دیتا، مگر اللہ کا اپنا ٹائم ٹیبل ہے کہ پنجابی میں 'ڈاہڈا' ہے۔ ہمارے ساتھ وہی ہوا جو صوفی تبسم کے پانچ چوہوں کے ساتھ ہوا۔ ایک عید پر ہم پانچ لوگ، تینوں بھائی، والد صاحب اور ایک بھتیجا نماز پڑھنے گئے۔ اگلی عید پر چار، اس سے اگلی پر تین اور جب باقی رہ گئے دو تو میں نے بھتیجے سے کہا،

''اب ہو چکی نماز مصلّہ اٹھایئے''

بات موت کی نہیں
موت تو برحق ہے

ے موت سے کس کو رستگاری ہے
آج میری ہے کل تمہاری باری ہے

غالب نے کہا تھا:

''مرنے والوں کا غم وہ کرے جسے خود نہ مرنا ہو''

میرا مقصد شامِ غریباں منعقد کرنا نہیں۔ ہم لوگوں پر جو تین سال کے عرصہ میں بیتی میں، تو اس کے بعد پس ماندگان کے تجربے کی بات کرنا چاہتا ہوں۔ ایک تو Survior's guilt ہوتا ہے۔۔۔ حادثے سے بچ جانے والوں کا احساسِ گناہ، جیسے یہ سب ہمارا کیا دھرا ہو۔

دوسری بات ہے للک کی، جس کا بالتفصیل ذکر کر چکا ہوں۔ آپ کی ذات میں ایک مسلسل تبدیلی آتی ہے۔ آپ کے ذہن کے اندرونی تھیٹر کو وہ لوگ آباد کردیتے ہیں جن کے ساتھ بھلے دن گزارے، عمر بتائی۔ ہوتا یوں ہے کہ جو لوگ فوت ہو جاتے ہیں وہ تو اکثر مر جاتے ہیں، صرف یادیں رہ جاتی ہیں۔ ہر کسی کے پاس یادیں ہیں اور اکثر و بیشتر شب تنہائی میں، کچھ دیر پہلے نیند سے، رلاتی ہیں۔

منزہ نے میکے گھر کی یادوں کو ربع صدی تک سینت سینت کر رکھا ہے۔ اک یاد ہے، اک سپنا ہے۔۔۔

ایہہ گلیاں تینوں سفنا تھیسن
گلیاں بابل والیاں۔۔۔
وہ بہت روئی ہے، سب کو رلایا ہے
We could cry oceans

میں بھی اُس دنیا کا حصہ ہوں جو منزہ کی اس کتاب کا موضوع ہے۔

اس بھاری غم نے منزہ کو بیمار کردیا۔ بہت علاج کیا، شفا نہ ہوئی۔ منزہ اس غیر مکمل ماتم Unfinished bereavement سے کبھی خالی نہ ہوئی، یہ عزیز از جان دکھ اس کی بیماری بن گیا۔

میں نے کہا'' منزہ یہ لکھ ڈالو''

''کیا لکھوں؟'' اس نے سوال کیا۔

''یہی سب کچھ۔۔۔''

اُس کی آنکھوں نے اس کا دکھ، خون کی صورت ٹپکانا شروع کیا صفحۂ قرطاس پر۔

خون بے رنگ نہیں ہوتا اس لیے اس تصویر میں سبھی رنگ آ گئے، زندگی کے رنگ، شوخ رنگ، غم کے رنگ، سرمئی رنگ۔

نتیجہ آپ کے سامنے ہے۔ ایک عام سے گھرانے کی عام سی باتیں، مگر جس فن پارے کی نمو، خونِ جگر سے ہو اس میں کچھ نہ کچھ عالمی سچائیاں یا Universal Truth بھی جھلکتے ہیں۔ ہر قاری کو اپنا عکس اور اپنے پیاروں کا عکس اس میں جھلکتا دکھائی دیتا ہے۔

ع میر نے دردو غم کتنے کیے جمع تو دیوان کیا

اس کتاب کی مثال گلدستے کی سی ہے، اگر آپ کو یاد ہو کہ گلدستہ کیا ہوتا تھا۔ آج کل تو پھولوں کو پلاسٹک میں لپیٹ کر بو کے کہہ لیتے ہیں، میں جس گلدستے کی بات کر رہا ہوں وہ تو تجربہ کار، چابک دست مالی ہی تیار کرتا تھا۔ کچھ رنگ برنگے پھول اور ان کے گرد ڈھیروں پتے، دھلے دھلائے، آلائشوں سے پاک۔ یہ پتے ہمارے عام سے دن ہیں۔ جن دنوں کوئی ڈرامہ نہیں ہوتا۔ کوئی ولیمہ یا چالیسواں نہیں ہوتا، بس عام سے دن۔۔۔ کہ زندگی انہیں سے عبارت ہے۔ یہی گلدستہ تقریباً ہر گھر میں موجود ہے۔ بس دیکھنے والی آنکھ چاہیے۔ منزہ نے زندگی کے حسن کو دیکھا ہے اور سب کو دکھایا ہے۔

اس نے اس چھوٹی سی کتاب میں، ایک کنبے کی کہانی میں سبھی کنبوں کی جھلک دکھلا دی ہے۔ اس طرح شاید وہ فیض صاحب کی مقرر کردہ میزان پر پوری اتری ہے کہ:

''ادیب اور شاعر کا کام، قطرے میں دجلہ دیکھنا اور دکھانا ہے۔''

ooo

پوہ دی دُھپ

میری پہلی کتاب آئی تو کچھ دن کے بعد بھائی نے کہا:

''بہتیری تعریفیں کروالی ہیں، اب اگلی کتاب شروع کرو۔''

''کیا لکھوں؟'' میں کہ ان کی اُنگلی تھامے، ادب کے میدان میں داخل ہوئی تھی، نے پوچھا۔

''ناول'' انہوں نے فیصلہ کن انداز میں کہا۔

''ناول؟؟؟۔۔۔ میں لکھوں؟''

''جی'' انہوں نے 'جی' پر زور دیتے ہوئے ذرا لمبا کر کے کہا۔

''میں کیسے لکھ پاؤں گی؟''

''جیسے پہلی کتاب لکھی ہے۔''

''وہ اور بات تھی۔۔۔ ناول!!!''

''تم لکھ سکتی ہو اور لکھو گی۔۔۔ ناول ادب کی ایسی صنف ہے جس میں سب کچھ لکھا جا سکتا ہے۔ اردو میں اس کی بہت کمی ہے۔''

گویا اب ایں و آں کی گنجائش نہیں رہی تھی سو شروع کر دیا اور حسبِ سابق جو لکھتی انہیں دکھاتی یا فون پر سناتی۔

ایک روز گھر پر آئے تو میں نے انہیں کتاب کا وہ حصہ سنایا جس میں ہیروئن کی شوہر سے علیحدگی ہو جاتی ہے اور وہ اپنی بہن کے خط کے جواب میں یہ نظم لکھ کر بھیجتی ہے۔

شیما نے جواب میں لکھا:

'اپنے شب و روز کیا لکھوں؟

بس ایسا ہے جیون۔۔۔

جیسے گھر بھر میں پھیلی چپ

جیسے دھول جمی شیشوں پر

جیسے راکھ کے اُڑتے ذرّے

جیسے گیت کے بکھرے پتّے

جیسے گلے میں چُبھتے آنسو

جیسے اپنے دل کی دھڑکن

جیسے پوس کی دھوپ اکیلی

جیسے سونا سونا آنگن

جیسے تن میں چھپا سناٹا

جیسے جاتے دن کی اداسی

جیسے آتی رین کا دھڑکا

بس ایسا ہے جیون،

اسے پڑھ کر انہوں نے نم آنکھوں اور سرخ چہرے کے ساتھ بھیگے ہوئے لہجے میں پوچھا۔

''یہ کس کی نظم ہے؟''

''فہمیدہ ریاض کی'' میں نے جواب دیا۔

بھابھی صاحبہ کی رحلت کے بعد وہ اس دکھ کا اظہار تو کم کم ہی کرتے، لیکن بہت ڈانوا ڈول ہو گئے تھے۔

کی کیتا تقدیرے۔۔۔

ڈاکٹر بھائی کو برین ہیمرج ہوا تو اس سے ان کے ذہن کا وہ حصہ متاثر ہوا جو Intelect سے متعلق تھا۔ اس سے ان کا میڈیکل کا علم، مختلف زبانوں پر مہارت، فلسفہ، اب سب کچھ اس کے ساتھ بہہ گیا۔ سماعت تو مکمل طور پر جاتی رہی وہ خود کہتے

90% of my English, 30% of urdu and 20% of Punjabi is gone.

ذخیرۂ الفاظ بہت محدود ہو گیا تھا۔ جس خزانے کو پانے میں انھوں نے تمام عمر صرف کر دی تھی۔ وہی لٹ گیا تو وہ اس صدمہ کو برداشت نہ کر پائے۔ مجھے یقین ہے کہ اگر کوئی جسمانی Handicap ہوتا تو وہ اس سے نبرد آزما ہونے کی پوری کوشش کرتے اور کامیاب بھی ہوتے۔ بستر پر بیٹھ کر مریض دیکھتے، کمپیوٹر پر کام کرتے، کتابیں پڑھتے، دوستوں اور گھر والوں سے پہلے کی طرح گپ شپ لگاتے لیکن یہ سب کچھ چھن گیا تو اپنی تہی دامنی سے سمجھوتہ ان کے لیے بہت مشکل ہو گیا۔ جتنی دیر یہ اُمید باقی رہی کہ بہتری کی کوئی صورت نکل آئے گی، انھوں نے حوصلہ برقرار رکھا لیکن پھر مایوسی نے انہیں بے بس کر دیا۔

ے اگے وی کجھ نظر نئیں آؤندا
یاد وی کجھ نئیں رہندا

سبھی ان کے لیے دست بدعا تھے اور ہر بار ڈاکٹروں کی رپورٹ کا انتظار کرتے ہوئے کسی اچھی خبر کے منتظر رہتے، لیکن رپورٹ کی روشنی میں ہماری دعائیں ایسی ہی آتیں جیسے ہم کہہ رہے ہوں

'شالا، ڈوتے ڈوبنج تھی ونجن'

○○○

ع ہن میں موئی نی میریئے ماں (شاہ حسین)

بھائی جان کی بیماری کے دوران میں ہر روز کالج سے واپسی پر ان کے ہاں چلی جاتی اور کبھی وہ میرے ہاں آجاتے۔ اس دوران آپا جی، جو اسلام آباد میں ہوتی ہیں اور عرصہ سے علیل ہیں، بہت زیادہ بیمار ہو گئیں اور ہسپتال داخل تھیں۔ میں انہیں دیکھنے اسلام آباد چلی گئی اور زرقا (بھتیجی) سے کہا کہ بھائی جان کو نہ بتائے، کیونکہ وہ نہ تو جا سکتے ہیں اور نہ ہی کچھ کر سکتے ہیں، سوائے پریشان ہونے کے۔

مجھے اسلام آباد میں چار، پانچ روز لگ گئے۔ ایک دو روز تو بھائی جان نے میری غیر موجودگی کو نظر انداز کیا پھر زرقا سے کہنے لگے:

''زائی کو 'ابا' کی یاد نہیں آتی؟''

(زرقا ہماری دوسری نسل میں سب سے بڑی ہے۔ اس نے مجھے منزّہ سے 'زا' بنا دیا۔ وہ مجھے 'زا پھپھو' کہتی۔ مجھ سے چھوٹے کزنز نے مجھے 'زا با جی' کہنا شروع کر دیا۔ میری بیٹی نے 'سوچا' کہ اس کی ماں کا نام دراصل 'زابا' ہے۔ 'جی' احتراماً لگایا جاتا ہے۔ اس نے مجھے 'زابا' کہنا شروع کیا تو سب گھر والوں نے مجھے 'زابا' کہنا شروع کر دیا۔ زرقا کا بیٹا احمد عزیز، ہماری تیسری نسل کا پہلا فرد ہے۔ وہ مجھے 'زائی نانی' کہنے لگا۔ غرضیکہ:

ے میں کی کی بھیس وٹائے

یہ تو ہوئی 'زائی' کی وضاحت، اب رہی 'ابّا' کی بات۔۔۔تو نہ جانے کیسے، شدید بیماری کے دوران بھائی جان نے خود کو 'ابّا' کہنا شروع کر دیا۔ (حالانکہ ان کی بچیاں انہیں 'ابّو جی' کہتی تھیں) اپنی بات کرتے تو خود کو ابّا کہتے۔

''ابّا کو یہ چاہیے''

''ابّا کو بھوک لگی ہے''۔۔۔وغیرہ

آج 'زائی' کو 'ابّا' کی بہت یاد آتی ہے، لیکن مجھے کوئی یہ بھی تو بتائے کہ 'زائی' کیا کرے؟

ooo

صدقے میں ونجاں اونہاں راہاں توں (شاہ حسین)

بھائی جان اپنی شدید بیماری کے دوران اکثر میرے ہاں آ جاتے اور سارا دن اں گزارتے۔ میں ان کے ساتھ لکھ لکھ کر باتیں کرتی۔ ضیا (میری بیٹی) ان کے لیے یزی کھانا بناتی۔ دونوں نواسیاں سارا وقت ان کے ارد گرد رہتیں۔ وہ ان سے بہت پیار رتے تھے۔ ان کی تعلیمی کارکردگی اور دیگر مشاغل کو دیکھ کر خوش ہوتے اور انہیں بڑھاوا نے کے لیے، تعریف کرتے اور ترغیب دلاتے۔ بڑی نواسی اصبح اپنی تحریریں اور پینٹنگز ھاتی اور چھوٹی اعلیٰ بھاگ کر وائیٹ بورڈ لے آتی اور کہتی:

''ڈاکٹر نانا! ٹِک۔ٹیک۔ٹو کھیلیں؟''

میرے میاں اور عاصم (داماد) آفس سے آتے تو سب اکٹھے مل کر بیٹھتے۔ محفل تی تو وہ اپنی حسِ سماعت کی غیر موجودگی کو جس حد تک ممکن ہوتا، اس پر اثر انداز نہ نے دیتے۔

رات کو، ان کی بڑی بیٹی ڈاکٹر زرقا اور داماد، عامر عزیز انہیں لینے کے لیے جاتے۔ ان کی بیماری کے پیشِ نظر میں رکنے کے لیے اصرار نہ کرتی۔ زرقا کی شکل میں انہیں قت ڈاکٹر میسر رہتا۔

جب زرقا مجھے فون کرتی کہ ابّو کہہ رہے ہیں مجھے زائی کے ہاں لے جاؤ، تو میرے اندر سے خوشی کی لہر اٹھتی۔

سے کوٹھے تے چڑھ کے ویکھدی نی مائے
کتے ویکھدی ویرے دا راہ
دوروں تے ویکھاں میرا ویر پیا آوے
میرا آیا اے ساہ وچ ساہ

اور اب وہی راہیں سرگوشیاں کرتی ہیں۔

ع اب یہاں کوئی نہیں، کوئی نہیں آئے گا

ooo

میٹوں ترے جیہا ہور کوئی لبھدا ناں (بلّھے شاہ)

ڈاکٹر بھائی کی آٹھ ماہ کی شدید بیماری کے دوران، ان کی بڑی بیٹی ڈاکٹر زرقا، اس کے شوہر عامر عزیز اور اس کے والدین، میرے شوہر میجر سلیم اور ڈاکٹر احسان الحق صاحب نے جس جانفشانی سے ان کا علاج معالجہ اور دیکھ بھال کی، اس کے لیے میں ان سب اصحاب کے لیے سراپا سپاس ہوں۔ ان میں سے ہر ایک نے اپنے رشتے کو بطریقِ احسن نبھایا لیکن نہ جانے کیوں میں ان سب کی ممنونِ احسان ہوں۔ شاید۔۔۔ میں سمجھتی ہوں کہ ڈاکٹر بھائی صرف میرے تھے۔۔۔ (میں ہی نہیں ان کے سب چاہنے والے یہی سمجھتے ہیں)

اور ان کا جان سے پیارا نواسا۔۔۔ احمد عزیز۔ ڈاکٹر بھائی آخری وقت میں اس کا سامنا کرنے سے تھوڑا کتراتے تھے شاید وہ نہیں چاہتے تھے کہ اسے چھوڑ کر جاؤں یا وہ سمجھتے تھے کہ احمد کو انہیں اس حالت میں نہیں دیکھنا چاہیے۔

رخصت ہو جانے کے بعد انہیں ہسپتال سے گھر لایا گیا تو گھر بھر میں وحشت ناک سناٹے کا راج تھا۔ اچانک زوردار چھناکے کے ساتھ کسی چیز کے ٹوٹنے کی آواز آئی۔ پتا چلا کہ شدتِ رنج میں احمد عزیز نے کلاک میں گھونسا مارا اور وہ ٹوٹ گیا۔ وہ بھی اپنے نانا کی

طرح عام طور پر اپنی پریشانی کا اظہار نہیں کرتا لیکن اس وقت پیمانہ لبریز ہو کر چھلک گیا تھا، لیکن:

ع شکستِ شیشۂ دل سے صدا نہیں آتی

ان کی نواسی آمنہ عزیز ان سے لاڈ پیار کرتی، Get Well کارڈز بنا کر دیتی۔ میری نواسیاں اصبح عاصم اور احلیٰ عاصم بھی اپنے ڈاکٹر نانا سے بے حد پیار کرتی تھیں۔ ان کے لیے کارڈز بناتیں، ان کے ساتھ گیمز کھیلتیں۔۔۔ میں نے کہا نا ہر شخص یہی سمجھتا تھا کہ وہ صرف اسی کے ہیں۔

○○○

ع اتھے رہنا ناہیں، کوئی بات چلّن دی کر وو!

(شاہ حسین)

کلمۂ شہادت کی گونج میں، وہ میرے بھائی کو میرے سامنے اٹھا کر لے گئے۔ میں نے انہیں روکا بھی نہیں اور نہ ہی مڑ کر دیکھا پھر بھی پتھر کی ہو گئی۔ نہ تو میری آنکھ سے آنسو بہا اور نہ ہی میں نے سینہ کوبی کی۔ میں خالی ہاتھ اس خالی رستے کو تکتی رہی لیکن اپنا دامن چاک نہ کیا۔ اس متاعِ بے بہا کے لُٹ جانے پر بھی میں خاموش رہی۔ بھائی! میں حیران ہوں کہ کس انداز سے میں نے آپ کا سوگ منایا۔

آخری وقت میں بھی آپ کے چہرے پر تجلی مسکراہٹ تھی، لیکن میری مسکراہٹ، آپ چپکے سے ساتھ لے گئے اور مجھے خبر تک نہ ہوئی۔

ے کتنے ہونٹوں کی ہنسی ساتھ گئی ہے اس کے
موت بھی سوچ رہی ہو گی کہ کون آیا ہے؟

○○○

ع اُٹھ دردمنداں دِیا دَردیا (امرتا پریتم)

جنازہ لے جایا جاچکا تھا۔ کوئی ویرانی سی ویرانی تھی۔ اتنے لوگوں کی موجودگی میں بھی دل میں تنہائی کی گھٹن تھی۔ برآمدے کی سیڑھیوں پر بیٹھا ایک مفلوک الحال شخص دھاڑیں مار مار کر رو رہا تھا۔

''ڈاکٹر صاحب چلے گئے اور میں ان کا آخری دیدار بھی نہ کرسکا۔''

اسے کوئی نہیں پہچانتا تھا۔ میں نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھا تو اس نے سر اٹھایا اور بلکنے لگا۔

''باجی میرے ڈاکٹر صاحب''

میں خشک آنکھوں سے اسے دیکھتی رہی۔ میں نے کہا:

''ڈاکٹر صاحب میرے بھائی تھے۔ آپ کون ہیں؟''

وہ کہنے لگا۔

''باجی، میں ان کا مریض ہوں۔ وہ مجھے چھوڑ گئے، کس کے آسرے؟''

''خدا کے آسرے۔'' میں نے دھیرے سے کہا۔

''وہ تو ٹھیک ہے لیکن ان جیسا پیارا بندہ مجھے کہاں ملے گا؟''

اس بات کا میں اسے کیا جواب دیتی؟

وہ آہستہ آہستہ باتیں کرنے لگا۔ آنسو اب بھی اس کی آنکھوں سے رواں تھے۔

''باجی، میں تانگہ چلاتا ہوں۔ میری طبیعت ٹھیک نہیں رہتی۔ کچھ دن، ایسا ہوتا ہے کہ کام پر جانے کو دل نہیں چاہتا۔ چادر میں منہ چھپا کر لیٹا رہتا ہوں۔ گھبراہٹ اور بے چینی مجھے پریشان کردیتی ہے۔ میرے ایک دوست نے کہا کہ ڈاکٹر کو دکھاؤ۔ میں نے اس سے کہا کہ میری کمائی میں تو میرے گھر کا خرچہ پورا نہیں ہوتا۔ میرے پانچ بچے ہیں جی! میں علاج کے لیے پیسے کہاں سے لاؤں۔ اس نے مجھے 'میرے' ڈاکٹر کا پتا بتایا اور کہا کہ جاؤ وہ تم سے فیس نہیں لیں گے۔''

وہ تھوڑی دیر کے لیے رکا اور پھر گھٹنوں میں سر دے کر رونے لگا۔ میں نے بھی اسے منع نہیں کیا۔

وہ پھر باتیں کرنے لگا۔

''میں ایک دن شام کو گیا۔ 'کمپوڈر' دکان بند کر رہا تھا اور ایک انگریزوں جیسا سوہنا بندہ کوٹ پینٹ پہنے، ٹائی لگائے، گاڑی میں بیٹھا اور چلا گیا۔ میں نے سوچا یہ مجھے دیکھے گا؟ میں گھر واپس آ گیا۔ پھر کچھ دنوں کے بعد میری طبیعت خراب ہوئی تو میرے دوست نے پھر مجھے سمجھایا اور جانے کو کہا''

وہ مسکرایا۔

''میں اپنی بیوی کو بھی ساتھ لے گیا۔ جب میری باری آئی تو میری بیوی نے تو میرے ڈاکٹر کو دیکھ کر دانتوں میں انگلی دبالی اور میرے کان میں کہنے لگی۔

''ایڈا سوہنا!''

ڈاکٹر صاحب نے مجھ سے ساری حقیقت پوچھی، پھر میری بیوی سے کہنے لگے۔

"جن دنوں یہ بیمار ہوتا ہے اور کام پر نہیں جاتا تو گھر کا خرچہ کیسے چلتا ہے؟"

میری بیوی نے بتایا کہ پہلے تو میں لوگوں کے گھروں میں کام کر لیتی تھی۔ اب جب سے مجھے ٹی۔ بی ہوئی ہے بہت مشکل ہو گئی ہے۔

پھر ڈاکٹر صاحب نے دو 'رقعے' لکھے۔ دونوں پر پیسے رکھے۔ ایک رقعہ مجھے دیا کہ یہ تمہاری دوائی ہے اور یہ اس کے لیے پیسے۔ دوسرا 'رقعہ' اور پیسے میری بیوی کو دیے اور کہا کہ ٹی۔ بی ہسپتال جا کر ڈاکٹر صاحب کو دینا، تمہیں مفت دوائی دے دیں گے۔ بھلا ہو میری بیوی کا، اس نے بھی لالچ نہیں کیا۔ کہنے لگی، پھر یہ پیسے کس لیے دیے ہیں۔ وہ کہنے لگے:

"پھل اور دودھ کے لیے"

وہ شخص پھر زار زار رونے لگا۔ اب میرے پاس اسے چپ کروانے کا کوئی جواز نہیں تھا۔

OOO

روزنامہ جنگ لاہور

11 Aug 2010

ڈاکٹر مقبول اختر کے لیے اجتماعی دعا آج ہوگی

فیصل آباد ماہرِ نفسیات ڈاکٹر مقبول اختر کی روح کے ایصال ثواب کے لیے قل خوانی اور اجتماعی دعا آج آٹھ بجے صبح مسجد عائشہ گلستان کالونی فیصل آباد میں ہوگی۔

روزنامہ نوائے وقت لاہور

11 Aug 2010

ڈاکٹر مقبول اختر کے ایصال ثواب کے لیے ختم قل آج ہوگا

فیصل آباد ماہرِ نفسیات اور دانشور ڈاکٹر مقبول اختر کے ایصالِ ثواب کے لیے ختم قل خوانی اور اجتماعی دعا آج 11 اگست کو آٹھ بجے صبح مسجد عائشہ گلستان کالونی فیصل آباد میں ہوگی۔ مرحوم کی نمازِ جنازہ گزشتہ روز بڑے قبرستان غلام محمد آباد میں ادا کی گئی۔ جس میں

ڈویژنل کمشنر طاہر حسین، ڈی جی ایف، ڈی اے ڈاکٹر ارشد محمود، پرنسپل پی ایم سی ریاض حسین ڈب، ڈائریکٹر فنانس اینڈ پلاننگ ڈاکٹر طارق سردار کے علاوہ سرکاری افسران، کاروباری، سماجی وادبی شخصیات اور مرحوم کے عزیز واقارب نے شرکت کی۔

روزنامہ امن فیصل آباد

11 Aug 2010

ڈاکٹر مقبول اختر کی روح کے ایصال ثواب کے لیے قل خوانی آج ہوگی

فیصل آباد معروف ماہرِ نفسیات اور دانشور ڈاکٹر مقبول اختر کی روح کے لیے قل خوانی اور اجتماعی دعا آج گیارہ اگست آٹھ بجے صبح مسجد عائشہ گلستان کالونی فیصل آباد میں ہوگی۔ دریں اثناء مرحوم کی نمازِ جنازہ گزشتہ روز بڑے قبرستان غلام محمد آباد میں ادا کی گئی۔ جس میں ڈویژنل کمشنر طاہر حسین، ڈی جی ایف ڈی اے ڈاکٹر ارشد محمود، پرنسپل پی ایم سی ڈاکٹر ریاض حسین ڈب، ڈائریکٹر فنانس اینڈ پلاننگ ڈاکٹر طارق سردار کے علاوہ سرکاری افسران، کاروباری، سماجی وادبی شخصیات اور مرحوم کے عزیز واقارب نے بھاری تعداد میں شرکت کی۔

روزنامہ پیغام فیصل آباد

11 Aug 2010

ڈاکٹر مقبول اختر کی روح کے ایصال ثواب کے لیے قل خوانی اور اجتماعی دعا آج ہوگی

فیصل آباد معروف ماہرِ نفسیات اور دانشور ڈاکٹر مقبول اختر کی روح کے ایصالِ ثواب کے لیے قل خوانی اور اجتماعی دعا آج گیارہ اگست آٹھ بجے صبح مسجد عائشہ گلستان کالونی فیصل آباد میں ہوگی دریں اثناء مرحوم کی نمازِ جنازہ گزشتہ روز بڑے قبرستان غلام محمد آباد میں

ادا کی گئی جس میں ڈویژنل کمشنر طاہر حسین، ڈی جی ایف ڈی اے ڈاکٹر ارشد محمود، پرنسپل پی ایم سی ڈاکٹر ریاض حسین ڈب، ڈائریکٹر فنانس اینڈ پلاننگ ڈاکٹر طارق سردار کے علاوہ سرکاری افسران، کاروباری، سماجی وادبی شخصیات اور مرحوم کے عزیز واقارب نے بھاری تعداد میں شرکت کی۔ اظہارِ تعزیت کے لیے مرحوم کے سوگوران سے 0321-8663020 اور 0300-6633794 پر رابطہ کیا جا سکتا ہے۔

روزنامہ ایکسپریس فیصل آباد

11 Aug 2010

ڈاکٹر مقبول اختر سپردِ خاک، نمازِ جنازہ میں کمشنر سمیت اہم شخصیات کی شرکت

فیصل آباد معروف ماہرِ نفسیات اور دانشور ڈاکٹر مقبول اختر کی روح کے ایصالِ ثواب کے لیے قل خوانی اور اجتماعی دعا آج گیارہ اگست آٹھ بجے صبح مسجد عائشہ گلستان کالونی فیصل آباد میں ہوگی۔ دریں اثناء مرحوم کی نمازِ جنازہ گزشتہ روز بڑے قبرستان غلام محمد آباد میں ادا کی گئی جس میں ڈویژنل کمشنر طاہر حسین، ڈی جی ایف ڈی اے ڈاکٹر ارشد محمود، پرنسپل پی ایم سی ڈاکٹر ریاض حسین ڈب، ڈائریکٹر فنانس اینڈ پلاننگ ڈاکٹر طارق سردار کے علاوہ سرکاری افسران، کاروباری، سماجی وادبی شخصیات اور مرحوم کے عزیز واقارب نے بھاری تعداد میں شرکت کی۔

ے تینڈے باجھ وِیرا میں رُل ویساں
مینڈے دل دا شہر، ویران نہ کر

ڈاکٹر بھائی کی وفات کے بعد مجھ پر دکھ کو برداشت کرنے کے مختلف ادوار آئے۔

کبھی تو ایسا ہوتا کہ میں تعزیت کے لیے آنے والے شخص سے بھائی کے بارے میں باتیں کیے جاتی، دکھ کی، خوشی کی، صحت کی، بیماری کی، ان کے رخصت ہوجانے کی، اس کے بعد اپنی کیفیت کی۔ گویا عالم یہ ہوتا کہ

ے یا تیرا تذکرہ کرے کوئی
یا کوئی مجھ سے بات ہی نہ کرے

بعض اوقات مجھے یہ احساس بھی ہوتا کہ آنے والا شخص دل چسپی سے میری باتیں نہیں سن رہا۔ ظاہر ہے جو مجھ پر بیت رہی تھی اس کو کوئی اور اس شدت سے تو محسوس نہیں کر سکتا تھا۔ میرا دُکھ، میرا تھا۔

اور کبھی مجھے بالکل چپ لگ جاتی اور یوں لگتا کہ تعزیت کرنے والا، اس غم کو زیادہ محسوس کررہا ہے بہ نسبت میرے۔ وہی باتیں دہرا دہرا کر میں بالکل خالی ہوجاتی اور میرے

پاس کہنے کو کچھ باقی نہ رہتا۔ خالی الذہن اور خاموش، ویران آنکھیں لیے بیٹھی رہتی اور ساتھ میں یہ احساس بھی کہ تعزیت کے لیے آنے والا شخص یہ سوچ رہا ہے کہ مجھے اس کے پاس آنے کی کیا ضرورت تھی؟

ے بارِ الم اُٹھایا ، رنگِ نشاط دیکھا
آئے نہیں ہیں یونہی، انداز بے حسی کے

ایک روز ایسی ہی صورتِ حال سے گزرنے کے بعد مجھے ڈاکٹر بھائی کا سنایا ہوا لطیفہ یاد آیا اور میں پھوٹ پھوٹ کر رو دی۔

بھائی نے سنایا۔

''ایک میراثی کی والدہ کا انتقال ہوگیا۔ لوگ تعزیت کے لیے آنے لگے۔ پہلے آنے والے نے پوچھا۔

''اماں کو کیا ہوا تھا؟''

میراثی نے بتایا۔

''ماں جی صبح اُٹھیں۔ فجر کی نماز پڑھی، ناشتہ کیا اور اللہ بیلی ہوگئیں۔''

اور لوگ آئے، انہوں نے پوچھا۔

''اماں کی وفات کیسے ہوئی؟''

میراثی نے قصہ تھوڑا بڑھا دیا۔

''ماں جی صبح اُٹھیں، وضو کیا، فجر کی نماز پڑھی پھر قرآن مجید پڑھا، ناشتہ کیا اور پھر رخصت ہوگئیں۔''

ان کے بعد میں آنے والے لوگوں نے بھی یہی سوال کیا تو میراثی نے کہانی کو مزید طول دیا۔

''ماں جی نے تہجد پڑھی، پھر فجر پڑھی، قرآن مجید کی تلاوت کی۔ تھوڑی دیر ٹہلتی

رہیں، پھر ناشتہ کیا۔ اس کے بعد خدا حافظ کہا اور آنکھیں ہمیشہ کے لیے بند کر لیں۔''

لوگ آتے رہے اور میراثی ہر بار بڑھا چڑھا کر ان سے ماں کی وفات کا ذکر کرتا رہا۔ ایسے ہی شام ہو گئی تو وہ جو غم سے نڈھال تو تھا ہی، باتیں کر کر کے بھی بے حال ہو گیا تھا۔

ایسے میں کوئی تعزیت کے لیے آیا اور اس نے کہا:

''بہت افسوس ہوا، اماں کو ہوا کیا تھا؟''

میراثی نے جل کر کہا:

''چھڈ یار، پولیس مقابلے چ مر گئی۔''

000

ے اُڈ گئے بھور پھلاں دے کولوں، سن پتراں سن ڈالیاں
جت تن لگے سو ای تن جانے، ہور گلاں کرن سکھالیاں (شاہ حسین)

بھائی کے رُخصت ہو جانے کے پندرہ بیس دِن کے بعد، میں نے یونہی بیٹھے بٹھائے بھائی کے کلینک کا ٹیلی فون نمبر ڈائل کیا۔ کلینک بند تھا اور مجھے وہاں سے کوئی جواب ملنے والا نہیں تھا لیکن۔۔۔ اچانک بھائی کی آواز آئی۔

'آپ صبح گیارہ سے تین بجے تک رابطہ کریں۔'

آپ اندازہ کر سکتے ہیں کہ مجھ پر کیا بیتی ہو گی؟ یہ ''آنسرنگ مشین' تھی جس میں بھائی نے اپنی آواز میں پیغام ریکارڈ کر رکھا تھا۔ میں نے سوچا یہ کتنے مزے کی بات ہوتی اگر ہم واقعی گیارہ بجے سے تین بجے تک رابطے میں رہ سکتے۔ زیادہ نہیں تو تھوڑے پر بھی تو گزارہ کیا جا سکتا ہے نا! کجا اس کے کہ ہم بالکل تہی دست ہو جائیں۔

000

پاکستان مزدور کسان پارٹی کا ۲۹/اکتوبر ۲۰۱۰ء کو ڈاکٹر مقبول اختر کو خراجِ عقیدت پیش کرنے کے لیے کیے جانے والے اجلاس کا دعوت نامہ۔

پاکستان مزدور کسان پارٹی

ریفرینس: ڈاکٹر مقبول اختر 10 اگست 2010ء بروز منگل کو وصال فرما گئے ہیں۔ تمام زندگی بائیں بازو کی سیاست کی۔ ادیب انقلابی، سیاسی، سماجی، ثقافتی، مفکر تھے۔ ایک عظیم انقلابی سپوت تھے۔ ڈاکٹر مقبول اختر بلند پایا کے مارکسی مفکر تھے۔ تمام زندگی مارکسی فلسفے پر لیکچر دیا آخری وقت تک عوامی جمہوری انقلاب، سوشلزم، کمیونزم کیلئے جدوجہد کرتے رہے۔

ان کے انقلابی راستے پر چلتے ہوئے ہم انہیں خراج عقیدت پیش کرتے ہیں۔

مہمان خصوصی
افضل خاموش
مرکزی صدر پاکستان مزدور کسان پارٹی

مورخہ 29-10-10
بروز جمعۃ المبارک
شام 3 بجے

زیر صدارت
ضلعی صدر
حافظ سعید خان

بمقام: قائد اعظم ہال ڈسٹرکٹ بار فیصل آباد 0321-7842749, 0303-6354235, 0300-7705395

ع ایہہ دُکھ جا کہوں کس آگے (بُلّھے شاہ)

میرے ناول کا تقریباً ''۴/۳'' حصہ، بھائی کی زندگی میں لکھا جا چکا تھا لیکن جنوری ۲۰۱۰ء میں جب انھیں برین ہیمرج ہوا تو اس کے بعد لکھنے کا سلسلہ منقطع ہو گیا۔ حالانکہ وہ ہر دوسرے چوتھے دِن مجھے یاد دِلاتے رہتے کہ اسے پورا کرو لیکن میری طبیعت میں ان کی خرابیٔ صحت کی وجہ سے اِتنی فکر مندی اور بے چینی تھی کہ میں کوشش کے باوجود خود کو مجتمع نہ کر پائی اور ایک لفظ نہ لکھا جا سکا۔

انھوں نے اگست ۲۰۱۰ء میں رُخصت ہونے سے پہلے، مجھ سے آخری بات یہی کہی:

''کتاب مکمل کرنا۔''

اور پھر نہ جانے یہ کیونکر ہوا کہ میں نے کتاب مکمل کی اور وہ دسمبر میں چھپ گئی۔ جس روز میں نے مسودہ پریس میں بھیجا، میں اندر سی خالی ڈھنڈار ہو گئی۔ مجھے یوں محسوس ہوا کہ میں نے ابھی ابھی بھائی کو رُخصت کیا ہے۔ شاید وہ دِن رات کی مصروفیت ختم ہو گئی تو مجھ پر ایک بار پھر، نئے سرے سے، یہ حقیقت آشکار ہوئی کہ بھائی نہیں ہیں۔

چند روز بعد جب کتاب چھپ کر آئی تو اپنی تخلیق کو دیکھ کر خوش ہونے کی بجائے میں بے اختیار رو دی کہ آج اگر بھائی ہوتے تو کتاب وصول کرنے کا رنگ کچھ اور ہوتا۔

وہ کتنا خوش ہوتے۔۔۔ مجھے پیار کرتے۔۔۔ شاباش دیتے اور میں پھولے نہ سماتی۔۔۔ ان کی غیر موجودگی کے احساس نے مجھے ڈانواڈول کر دیا۔

؎ تیرے ہوتے ہوئے ہر دُکھ میں بھی سکھ شامل تھے
اب تو شامل ہے ہر اک سکھ میں تیری یاد کا دُکھ

○○○

؎ دُنیا طالب مطلب دی وو ، سچ سن وو ، سچ سن وو فقیرا
مطلب آوے مطلب جاوے ، مطلب پوجے گر پیرا (شاہ حسین)

بھائی کے لیے کتاب تو مجھے لکھنا ہی تھی، لیکن اس کا حوصلہ بہت دیر سے کر سکی۔ اس سلسلے میں، مَیں نے ان کے سبھی، دوست، احباب، ساتھیوں اور عزیزوں سے رابطہ کیا کہ ان کے بارے میں، لکھ کر مجھے دیں تا کہ میں کتاب میں شامل کر سکوں اور اس کے جواب میں کتنے ہی خوبصورت محبت نامے مجھے موصول ہوئے جو کتاب کی زینت بنے۔

لیکن بہت سے لوگ جو بھائی کی زندگی میں تو ان کے اردگرد نظر آتے تھے، نے لکھ کر دینا تو درکنار، میری درخواست جو میں نے بار بار کی، کا جواب دینا بھی مناسب نہ سمجھا۔ یہ ضروری نہیں ہے کہ وہ اپنی تحریر سے مجھے نوازتے، لیکن مجھے ہاں یا نہ میں جواب تو دے سکتے تھے کہ رسمِ دُنیا ہے لیکن میری درخواست، صدائے گنبد کی طرح مجھ تک واپس آ جاتی رہی۔

یہاں میں ان کے ایک 'نام نہاد' انتہائی قریبی ساتھی کا ذِکر ضرور کرنا چاہوں گی

جنھوں نے میرے SMS کا جواب فوری طور پر بذریعہ SMS دیا۔

میں نے لکھا تھا:

؎ حفیظؔ موت بھی ہے آزمائشِ احباب
یہ دیکھنا ہے کوئی نوحہ خواں بھی ہوتا ہے

میں ڈاکٹر مقبول اختر کے لیے ایک مختصر سی کتاب 'میرا قبلہ تے کعبہ' کے عنوان سے لکھ رہی ہوں۔ آپ بھی ان کے لیے کچھ کہنا چاہیں تو مجھے خوشی ہوگی۔

جس کے جواب میں انھوں نے لکھا:

؎ ڈھونڈو گے ہمیں مُلکوں مُلکوں
ملنے کے نہیں نایاب ہیں ہم

''تم ایک بہادر خاتون ہو، لکھ پاؤ گی۔ میرا قلم مقروض ہے ضرور لکھوں گا۔''

لیکن اِس کے بعد، لکھ کر دینا تو درکنار، انھوں نے آج تک مجھ سے یہ بھی نہیں پوچھا کہ کتاب کس مرحلے میں ہے؟

یہاں میں بھائی کی نذر ایک شعر کرنا چاہوں گی

؎ وہ اپنی ایک ذات میں کل کائنات تھا
دُنیا کے ہر فریب سے ملوا گیا مجھے

ooo

بوہتا چانن تے ڈھیر بھُلیکھے

رشتوں کے تاج محل خوبصورت تو بہت ہیں لیکن ان کی تعمیر خونِ جگر مانگتی ہے۔ بھائی جان نے رشتوں کی بنیادیں خونِ جگر سے ہی سینچیں۔ تابع فرمان بیٹا، پیار کرنے والا بھائی، خیال رکھنے والا شوہر، شفیق باپ، پیارا دوست، نرم دل طبیب، باشعور شہری، حسّاس، ہمدرد۔۔۔دانشور۔

میرے لیے تو وہ ایک عظیم درسگاہ تھے۔ وہ اس دنیا سے رخصت ہوتے ہوئے بھی مجھے بہت کچھ سکھا گئے۔ ان کی طرح میں بھی محبتوں میں یقین رکھنے والی ہوں اس لیے میں نے ہمیشہ محبت کو فاتحِ عالم سمجھا، لیکن بھائی جان کی آٹھ ماہ کی شدید بیماری میں ان کے ایسے ایسے 'دعویداران محبت' نے مڑ کر بھی نہ دیکھا کہ ہم۔۔۔ ڈاکٹر مقبول اختر کے چاہنے والوں نے ان کی بیماری کے ساتھ ساتھ، ان لوگوں کی بے وفائی کا صدمہ بھی برداشت کیا۔ توقعات کے یوں لٹ جانے پر وہ اس شخص کا نام لکھ کر اس پر x کا نشان لگا دیتے۔ منہ سے کچھ نہ کہتے۔۔۔ نہ گلہ نہ شکوہ۔ x کا نشان ان کی جس اندرونی کیفیت کا مظہر تھا، وہ ناقابلِ برداشت تھا۔ ہمیں یقین نہیں آتا تھا کہ یہ وہی لوگ ہیں جو ان کی صحت مندی میں ہر وقت ان کے اردگرد ہوتے تھے اور اب ایسے غائب تھے جیسے۔۔۔ حدّادب کچھ کہنے کی اجازت نہیں دیتی۔

حادثے سے بڑا، سانحہ یہ ہوا
کوئی ٹھہرا نہیں حادثہ دیکھ کر

آج ان کی وفات کو ایک سال ہونے کو آیا لیکن ان کی یاد میں کچھ کہنے سننے کی تو بات ہی کیا۔ تعزیتی ریفرنس تک نہ کیا گیا۔ شاید وہ لوگ اس مقولے پر یقین رکھتے ہوں گے کہ:

"یہ ایک عالمی سچ ہے کہ محبتوں کا ذکر کرتے ہوئے الفاظ
ہمیشہ کم پڑ جاتے ہیں۔"

حالانکہ میں تو سوچتی تھی کہ ایسی صورتِ حال ہو گی۔

اب تیرے ہجر میں اے فہم و ذکا کے یوسف
کتنی آنکھیں ہیں جو یعقوب ہوئی جاتی ہیں

تب میں نے جانا کہ محبت ہر ایک پر ضائع کی جانے والی چیز نہیں ہے۔ یہ صرف اور صرف انہی کا حصہ ہونا چاہیے جو اس کی قدر کر سکیں تا کہ آخر میں آپ خالی ہاتھ، شکستہ دل اور بے فیض نہ رہ جائیں۔

ہاں، ایسے بھی بہت ہیں جنہوں نے ان کی کمی اسی شدت سے محسوس کی ہے جس طرح سے اس پیارے شخص کی، کی جانی چاہیے تھی۔ اور۔۔۔ ان لوگوں کا نام لکھ کر بھائی جان نے لاتعداد '✓' کے نشان لگائے۔

OOO

اوالحاج سَن

میں نے اپنی زندگی میں بہت اتار چڑھاؤ دیکھے ہیں۔ 'بارِ الم' بھی اور 'رنگِ نشاط' بھی۔ ناقابلِ برداشت ترین صورتِ حال میں بھی ڈاکٹر بھائی نے اس انداز سے میری دلجوئی کی کہ عمر کے اس بے پایاں لق و دق صحرا میں، میں راستہ نہیں بھولی اور میرے پاؤں مضبوطی سے زمین پر جمے رہے۔ کوئی بھی مسئلہ ہو وہ دھیرج سے چند الفاظ میں ایسے اس کا حل پیش کرتے کہ شرمندگی سی ہونے لگتی اور میں سوچتی کہ میں نے ناحق بھائی جان کو پریشان کیا اور پھر یوں ہلکی پھلکی ہو جاتی جیسے تتلی ہواؤں میں ڈولتی پھرتی ہے۔ (ان کی وفات کے بعد بہت سے لوگوں نے بھی یہی بات کہی کہ وہ بھی میری طرح اپنے دکھوں کی جھولی ان کے کلینک پر خالی کر آتے تھے)

دل جوئی ایک فن ہے، لیکن کتنے ہیں جو اس سے واقف ہیں؟ 'بہت سے لوگ' تو پوری بات سننا گوارا ہی نہیں کرتے اور جو تھوڑی بہت کسی طرح سے کان میں چلی جاتی ہے، اسے سمجھ نہیں پاتے اور پھر اس کے جواب میں کچھ کہنا تو بعد کی بات ہے۔ یوں بغیر سلام دعا کے اٹھ کر چل دیتے ہیں کہ جیسے جانتے نہیں، پہچانتے نہیں۔۔۔ مجھے یہ احساس دے کر کہ کس پتھر سے سر پھوڑا!؟ اس لیے:

ے سخن جنہاں دا دارو ہووے

حال اتھائیں کہیے وو (شاہ حسین)

'باقی لوگ' بات سنتے تو ہیں لیکن جواب میں نصیحتوں کے انبار لگا دیتے ہیں یوں کہ دکھ سوا ہو جاتا ہے۔ 'کوئی چارہ ساز ہوتا، کوئی غم گسار ہوتا' کی خواہش تو غالب بھی دل میں لیے چلے گئے، میں کس گنتی میں ہوئی؟

فارسی میں کہتے ہیں۔

'دل بدست آور کہ حجِ اکبر است'

(دل جوئی کرنا، حجِ اکبر کے برابر ہے)

اب میں کیا، بھائی کے سبھی جاننے والے یہ کہتے ہیں کہ ڈاکٹر صاحب جیسا مخلص، ہمدرد اور دکھ کو سمجھنے والا کوئی نہیں تھا اور دل جوئی کرنا ان پر ختم تھا تو پھر فارسی کہاوت کے مطابق وہ ہر سال حج پر جاتے تھے اور ہر حج، حجِ اکبر ہوتا تھا۔

۷۰ء کی دہائی میں، مشہور شاعر مصطفےٰ زیدی قتل ہوئے تھے ایک حسینہ شہناز کے ہاتھوں۔ اس مقدمہ کو بہت شہرت ملی۔ عوام جوق در جوق، اس مقدمہ کی کارروائی سننے کے لیے عدالت کے باہر جمع ہوتے۔ ایک اخبار نے خبر لگائی کہ کل عدالت کے باہر، ایک بوڑھا شخص بھی موجود تھا۔ جب شہناز عدالت میں پیش ہونے کے لیے آئی تو اس کی خوبصورتی کو دیکھتے ہوئے اس بزرگ نے کہا:

''سچّا مریا اے''

بھائی جان کے متعلق مختلف مضامین پڑھنے کے بعد آپ کو اندازہ ہو گا اور آپ بھی کہیں گے۔

''منزہ سچّی دُکھی اے''

ooo

کانے کپ کے قلم بناواں، لکھ نہ سکن قلماں ھو (باہو)

ہم پانچ بہن بھائی تھے۔ سب سے بڑی آپا جی، پھر تین بھائی جن میں ڈاکٹر بھائی منجھلے تھے اور بھائیوں کے بعد میں۔ آپا جی ۱۹۹۰ء سے بیمار ہیں۔ Sarcoidosis کی مریضہ۔۔۔ یہ بیماری پاکستان میں خال خال ہے۔ اس بیماری کی دوا Steroid کے ذیلی اثرات سارے جسم کو بری طرح متاثر کرتے ہیں۔ اب تو وہ چند سالوں سے مکمل طور پر بستر پر ہیں لیکن حوصلہ بہت بلند ہے۔ ڈاکٹر بھائی کی وفات کے بعد وہ منہ سے کچھ نہیں کہتیں لیکن ان کی خالی نگاہیں، رازِ دروں فاش کر دیتی ہیں۔

پچھلے دنوں وہ زیادہ بیمار تھیں۔ پہلے تو ایسے مواقع پر ڈاکٹر بھائی انہیں فیصل آباد بلا لیا کرتے تھے۔ (وہ اسلام آباد ہوتی ہیں) یہاں وہ میرے پاس ٹھہرتیں، ضرورت ہوتی تو ہسپتال داخل کروا دیا جاتا۔ لیکن اب ایک سال ہو گیا ہے وہ فیصل آباد نہیں آئیں۔ میں نے بہت اصرار کیا تو کہنے لگیں۔

''حوصلہ نہیں ہے۔''

(ظاہر ہے بھائی کے بغیر شہر خالی لگتا ہے)

میں نے ڈاکٹر احسان الحق صاحب (بھائی کے عزیز ترین دوست جو ان کی زندگی

میں بھی ہم سب کے ڈاکٹر تھے اور اب تو ان کی شفقت پہلے سے بھی سوا ہے) سے ذکر کیا تو انہوں نے فوراً کہا:

''ہم چلتے ہیں۔ انہیں دیکھ آتے ہیں۔ ان کی Medical Help تو ہو گی ہی Psychologically بھی اچھا اثر پڑے گا۔''

(اللہ ڈاکٹر صاحب کو سلامت رکھے۔ اس محبت کا کوئی نعم البدل نہیں ہے)

ڈاکٹر صاحب نے اپنی ایک روز کی پریکٹس چھوڑی اور ہم صبح جا کر شام کو واپس آ گئے۔

آپا جی نے جن شکر گزار اور محبت بھری نگاہوں سے ڈاکٹر صاحب کو دیکھا اس سے اندازہ ہوا کہ ڈاکٹر صاحب کی بات بالکل درست تھی کہ انہیں نفسیاتی طور پر بہت فائدہ ہو گا۔

(ڈاکٹر صاحب کی صحت کے پیش نظر انہیں ایک دن میں اتنا سفر کرنے سے یقیناً تھکاوٹ ہوئی ہو گی لیکن مجال ہے جو انہوں نے اس کا اظہار کیا ہو)

میں نے آپا جی سے کہا کہ آپ ڈاکٹر بھائی کے لیے کیا لکھنا چاہتی ہیں؟ آپ لکھوائیں میں لکھ دیتی ہوں۔ (آپا جی ڈبل ایم۔اے ہیں، انہوں نے ۱۹۶۲ء میں اورینٹل کالج سے ایم۔اے اُردو کیا اور ۱۹۶۴ء میں IER پنجاب یونیورسٹی نیو کیمپس سے 'فرسٹ بیچ' میں ایم۔اے ایجوکیشن کیا)

کہنے لگیں:

''کیا لکھواؤں؟ منتشر سے خیالات ہیں۔''

پھر مختصراً انہوں نے جو کچھ کہا، اس کی ترجمانی محسن نقوی کا یہ شعر کر رہا ہے۔

اسے گنوا کے میں زندہ ہوں اس طرح محسنؔ
کہ جیسے تیز ہوا میں چراغ جلتا ہے

۔۔۔اس کے بعد ایک لمبی چپ اور تیز ہوا کا شور۔

OOO

ربّا میرے حال دا محرم توں (شاہ حسین)

۔۔۔میں نے اس کتاب کو کیسے لکھا؟۔۔۔

یہ میں جانتی ہوں یا میرا ربّ۔۔۔

OOO

ع نالے اساں ونڈ لئے نے ہنجواں دے ٹک ٹک

ڈاکٹر مقبول اختر کے احباب کے مضامین

بسیار خوباں دیدہ ام لیکن تو چیزے دیگری

-ڈاکٹر احسان الحق-

جس ہستی کا ذکر میں آج کرنے جا رہا ہوں، سوچتا ہوں نقطہ آغاز کہاں سے کروں۔

جیسا کہ کسی نے کہا ہے کہ محبت نامہ (Love letter) لکھنا بہت مشکل کام ہے کہ آپ کو پتا ہی نہیں چلتا کہ شروع کیسے کریں اور ختم کس طرح۔

میری حالت بھی کچھ ایسی ہی ہے۔ مجھے یہ محبت نامہ ایک ایسے محبوب کے نام لکھنا پڑ رہا ہے جو ہم سے۔۔۔ کیسے کہوں؟۔۔۔ کہ۔۔۔ ہمیشہ کے لیے بچھڑ گیا ہے۔ گو کہ وہ میرے دل کے ایک خاص گوشے میں ہر وقت جاگزیں ہے۔ زندہ ہے۔

رفتید و لے نہ از دل ماست

سوچ رہا ہوں کہ کہانی کا آغاز کہاں سے کروں؟

تا سر رشتہ ندانم کہ کجا بکشایم

یاد کے دھاگے الجھے ہوئے ہیں اور کوئی سرا نہیں ملتا کہ اس گنجلک کہانی کو کھول

سکوں اور بیان کرسکوں۔

لیکن ایک دوسری بات بھی ہے۔

ـــــ امیر جمع ہیں احباب دردِ دل کہہ لے

پھر التفاتِ دلِ دوستاں رہے نہ رہے

کیا میں آپ سے پوچھ سکتا ہوں کہ آپ نے زندگی میں کبھی تنہا محسوس کیا ہے؟

خدانخواستہ۔۔۔ کیا آپ کا کوئی بہت عزیز دوست۔۔۔ جان سے عزیز دوست، آپ سے بچھڑا ہے۔ انگریزی زبان کی ایک مشہور نظم ہے۔ Of in the stilly night جس کا مصنف Thomas Moore ہے۔ اس کا ترجمہ نادر کاکوروی نے اردو زبان میں کیا ہے۔

میں اس کے شروع کے چند اشعار لکھ رہا ہوں تاکہ آپ کو اپنے درد میں شریک کرسکوں۔

'اکثر شبِ تنہائی میں
کچھ دیر پہلے نیند سے
گزری ہوئی دلچسپیاں
بیتے ہوئے دن عیش کے
بنتے ہیں شمعِ زندگی
اور ڈالتے ہیں روشنی
مرے دلِ صد چاک پر،

میں تو یہی دعا کرسکتا ہوں کہ

'ایس تو ڈھاڈا دکھ نہ کوئی
پیار نہ وچھڑے
کسے دا یار نہ وچھڑے

ڈاکٹر مقبول اختر سے میرا پہلا تعارف، نشتر میڈیکل کالج کے ہاسٹل، قاسم ہال

میں ہوا۔ وہ مجھ سے ایک سال آگے تھے اور مقبول اختر موٹا کے نام سے جانے جاتے تھے کہ وہ کچھ فربہ جسم واقع ہوئے تھے۔ بعض اوقات، نشتر کالج میں اصطلاحاً ایسے فربہ اشخاص کو 'پتلا' جیسے مقبول اختر پتلا کے لاحقے سے بھی یاد کیا جاتا تھا۔

ناموں کی بھی عجیب کہانی ہے۔ ایک مشہور مزاحیہ انگریزی نظم اسی بات پر لکھی گئی ہے مثلاً ایک شعر یوں ہے

Mr. Box has never
twisted his fist

یہ ایسے ہی ہے کہ ماں باپ نے نام تو فہیم رکھ دیا ہے مگر صاحب، دوسروں کی بات سمجھنے سے عاری ہیں۔ عقیل صاحب کا عقل وفہم سے دور کا بھی واسطہ نہیں اور ہر وقت اپنی ڈفلی بجاتے رہتے ہیں۔

یا اگر نام 'نسیم' ہے تو ان کی باتوں سے خوشبو آنا تو درکنار، لوگ ان سے دور بھاگتے ہیں۔

مگر بعض لوگ، واقعی اسم بامسمّٰی ہوتے ہیں مثلاً ہمارے دوست جان محمد ہمیں جان سے عزیز ہیں۔ اکرام صاحب ہم پر بہت مہربان ہیں اور ریاض صاحب مرحوم کی شگفتگی مثالی تھی۔

ڈاکٹر مقبول اختر کا نام، ان کے والدین نے کسی ایسی شبھ گھڑی میں چنا ہوگا کہ وہ بارگاہِ ایزدی میں قبولیت کا وقت ہوگا۔

یہ ستارہ ایسا چمکا کہ جہاں گیا، جدھر گیا، اپنی روشنی سے لوگوں کے دل جگمگاتا گیا۔ ان کے دلوں میں نور بھرتا گیا۔ اس کی محفل میں یہ نور اس کے ہم مجلسوں کے چہروں کی روشنی سے عیاں تھا۔

چاہے وہ دانشوروں کی مجلس ہو یا عوامی جلسہ، لکھنے والوں کا حلقہ ہو یا ان پڑھوں کا مجمع۔ ان کی شخصیت کا پرتو اس ستارہ (اختر) کی چمک، ان کی مہربان نظر کی چاندنی۔۔۔

ان کا دلی خلوص، ان کی روشن مسکراہٹ، فاتح عالم محبت کی طرح، ہر دل کو مسخر کر لیتی تھی۔

میں مبالغہ آرائی سے کام نہیں لے رہا۔ حقیقت بیان کر رہا ہوں۔ ان کے مریض بھی، ان کی شخصیت کے ایسے پہلوؤں کی وجہ سے ان سے بہت خوش تھے اور یہ اُن میں بہت مقبول یعنی اسم بامسمّی۔

اسی ضمن میں بیان کر دوں کہ اپنا پروفیشنل کام بہت لگن اور محنت سے کرتے تھے۔ دوائیں کم سے کم استعمال کرتے۔ مریض کی بہت دل داری کرتے۔ اس کی مالی حالت کے مطابق نسخہ تجویز کرتے۔ ان کا بہت سا کام فی سبیل اللہ تھا اور وہ مریضوں کے شکریہ یا محض ایک احسان مند نظر پر قانع تھے۔ بعض اوقات ادویہ بھی بغیر معاوضہ عنایت فرماتے۔

اس سب سے بڑھ کر ان کی طرف سے ہمدردی کے دو بول اور مہربان نظریں، مریضوں کے پوشیدہ، دل کے زخموں پر مرہم ثابت ہوتیں۔ ان کی باتوں کے پھول اور زبان کی شیرینی، ہر سو ایک خوشبو بکھیرتے اور کانوں میں رس گھولتے۔

ان کا مدھم لہجہ، ان کی سدابہار مسکراہٹ، ان کی ہمدرد نظر کی چاندنی، ماحول میں ایسی ٹھنڈک بھر دیتے تھے جو طراوتِ جاں کا باعث ہوتی تھی اور مریض ان کی شخصیت کے حصار اور موجودگی کے احساس ہی سے سرشار ہو کر بہتر محسوس کرتا تھا۔

امیر خسرو، اپنے والد صاحب کے متعلق رقمطراز ہیں (امیر خسرو کے والد ترک النسل تھے۔)

''کہاوت ہے کہ ترک خواب میں ہی فرشتہ ہو سکتا ہے مگر وہ عالم بیداری میں بھی فرشتہ تھے۔''

میں ڈاکٹر مقبول اختر کے بارے میں کہہ سکتا ہوں کہ وہ فرشتہ سیرت تھے۔ وہ انسان کے روپ میں بھگوان تھے، جیسا کہ ہمارے ہمسائے میں لوگ کہتے ہیں۔ وہ مخلوق خدا کے لیے اپنے دل میں درد رکھتے تھے اور ان کے لیے سب کچھ کر گزرنے کے لیے تیار

رہتے تھے۔ مریضوں کی مدد، ان کی دل جوئی اور ان کے درد کو اپنا درد محسوس کرنا ان کا شیوہ تھا۔ اس لیے ہم کہہ سکتے ہیں کہ انھوں نے اپنے لیے صحیح پیشے کا انتخاب کیا تھا، یعنی جب انھوں نے سائیکاٹری کو بطور اختصاص (Speciality) کے چنا۔ ایک ماہر نفسیات کے لیے سب سے بڑی خوبی یہی ہے کہ وہ مریض کا درد محسوس کر لے۔ خاص طور پر جب مریض کا زخم بیرونی نہیں بلکہ اندرونی ہو۔ یعنی اس کا دِل داغ داغ ہو اور وہ نفسیاتی طور پر زخمی ہو۔

ڈاکٹر صاحب، دوا سے زیادہ، مریض سے بات چیت، گفتگو، تحلیل نفسی اور مریض کو خود اپنا تجزیہ کرنے کی ترغیب دے کر علاج کرنے کے قائل تھے۔

ان کے مریض، ان کو اپنے کام میں صحیح متخصص اور مکمل طاق مانتے تھے۔

ہاں تو میں ذکر کر رہا تھا کہ وہ واقعی فرشتہ سیرت تھے۔ ان کے چہرے پر ایک دائمی مسکراہٹ رہتی تھی۔ کیسی بھی مشکل ہوتی کتنی بھی اداسی ہوتی ان کی Signature smile (شخصی امتیاز یعنی دائمی مسکراہٹ) کبھی غائب نہ ہوتی۔ حتیٰ کہ آخری بیماری اور آخری دنوں میں بھی ان کا سدا مسکراتا ہوا چہرہ آپ کا استقبال کرتا۔ ان کے جانے سے ایک روز پہلے، میں ان کا معائنہ کر کے، ساتھ والے کمرے میں بہت اُداس اور غمگین بیٹھا تھا کہ انھوں نے مجھے بلاوا بھیجا۔ مجھ میں ہمت نہیں تھی کہ ان کے پاس دوبارہ جاؤں میں نے ان کی بہن منزہ سے کہا کہ ابھی آتا ہوں۔ انھوں نے دوبارہ اصرار کر کے بلایا۔ میں اندر آیا تو وہی مسکراتا ہوا چہرہ مجھے اپنے پاس بلا رہا تھا۔ میں قریب گیا تو میرا ہاتھ پکڑ کر محبت سے خوب دبایا اور مسکراتے ہوئے کہا:

''سر جی، تھینک یو ویری مچ''

(Sir G, thank you very much)

مجھے یقین ہے کہ جب اپنے خالق حقیقی سے ملے ہوں گے تو کہا ہوگا۔

''کی حال اے سر جی؟ تھینک یو ویری مچ)

ان کا Sense of humour یعنی حسِ مزاح، ان کی شخصیت کا سب سے حسین اور امتیازی پہلو تھا کیا خوب طریقے سے معمول کی باتوں میں مزاحیہ عنصر کی نشان دہی کرتے اور حاضرین کے سامنے لاتے کہ محفل کشتِ زعفران بن جاتی۔ کیونکہ ان کا ہنسنا اور مسکرانا Infectious تھا۔

وہ دنیا کو خوبیوں اور نقائص کے ساتھ قبول کرتے تھے۔ اگر کہیں کوئی عیب نظر آتا تو کہتے It is a funny world اس کو ایسے ہی دیکھنا چاہئے اور enjoy کرنا چاہئے۔

ڈاکٹر صاحب ایک ہمہ گیر اور ہفت پہلو شخصیت کے مالک تھے۔ وہ بیک وقت ایک ڈاکٹر اور Specialist Psychiatrist بھی تھے اور نفسیات کے اعتبار سے Psychoanalist بھی۔ علاوہ ازیں ان کو فلسفہ میں خاصی دسترس حاصل تھی۔ خاص طور پر مارکسزم، سوشلزم اور تاریخی مادیت کے بارے میں ان کا مطالعہ بہت گہرا تھا بلکہ اس سارے فلسفہ کو ایسے گھوٹ کر پی لیا تھا کہ وہ آسانی سے اس کے تعلق سے پاکستان کے موجودہ حالات پر اس کی تطبیق کرتے تھے۔ اس طرح وہ پاکستان مزدور کسان پارٹی کے نظریہ دان کی حیثیت سے پہچانے جاتے تھے۔ وہ اپنی پارٹی کے دانشور اور ایک عام کارکن کے طور پر نچلی سطح پر عامتہ الناس کے ساتھ مل کر کام کرنے والے کامریڈ تھے۔ ان کی یہ حیثیت بھی ان کی طرح دار شخصیت کا حصہ تھی۔

علاوہ ازیں، وہ ایک مشہور و معروف، ادبی حلقوں میں جانے پہچانے ادیب تھے۔ وہ پنجابی زبان میں نثر اور نظم لکھتے تھے اور اردو زبان میں بھی۔ اس پر مستزاد یہ کہ انگریزی زبان کے بہت اچھے لکھنے والے تھے اور ان کی اس قابلیت کا لوہا مشہور زمانہ رسالہ Out Look کے ایڈیٹر برنی صاحب نے بھی مانا اور وہ خط خود میں نے بھی پڑھا ہے جو انہوں نے ڈاکٹر صاحب کی تعریف میں لکھا تھا۔

☆ (افسوس کہ بے انتہا کوشش کے باوجود، ڈاکٹر مقبول اختر کے بہت سے مضامین Out Look اور پارٹی سرکلر میں شائع شدہ) دستیاب نہ ہو سکے اور انہیں محفوظ نہ کیا جا سکا۔ مصنفہ)

برنی صاحب نے لکھا تھا:

"مجھے پتا نہیں کہ آپ کتنے اچھے ڈاکٹر ہیں لیکن یہ بات میں یقین کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ آپ انگریزی زبان کے بہت اچھے لکھک ہیں۔ میں امید کرتا ہوں کہ آپ لکھنے کا کام جاری رکھیں گے۔"

اس کے علاوہ ڈاکٹر صاحب عربی زبان کے اشعار اکثر Quote کرتے۔ فارسی تو گویا ان کی دوسری زبان تھی اور فارسی زبان کے شعرا حافظ، مولانا روم، سعدی اور اقبال کا با آسانی اور فراوانی سے حوالہ دیتے۔

اس طرح ہم کہہ سکتے ہیں کہ وہ ہفت زبان تو نہ تھے مگر پانچ زبانوں میں کافی دسترس رکھتے تھے اور ان زبانوں کے ادب سے خوب واقف تھے اور انگریزی، اردو اور پنجابی کے جانے پہچانے ادیب تھے۔

میں نے کہیں پڑھا ہے کہ مشہور ڈرامہ نگار آغا حشر کاشمیری (جنہیں منٹو نے اپنی کتاب 'گنجے فرشتے میں رنڈیوں کا پیر' سے تشبیہہ دی ہے۔۔۔ خیر یہ تو ایک جملہ معترضہ ہے) جو اردو کے شیکسپیئر کا درجہ رکھتے ہیں نے مولانا ابوالکلام آزاد کی شیریں زبان کے متعلق ایک مرتبہ فرمایا کہ:

"مولانا بولتے کیا تھے، کانوں میں رس گلے نچوڑتے تھے۔"

یہ یاد رہے کہ دونوں صاحبان کسی زمانے میں کلکتہ میں رہے تھے اور یقیناً بنگالی رس گلوں سے محظوظ ہوئے ہوں گے۔

اپنے ڈاکٹر مقبول صاحب بھی بہت شیریں دہن اور زیبا کلام تھے۔ ان کی برجستگی اور بے ساختگی ان کے اندازِ گفتگو میں ایک خاص شیرینی اور چاشنی بھر دیتی تھی۔ ہمارے کانوں نے بھی ان 'رس گلوں' کا مزا چکھا ہے۔ ان کی باتوں میں محسوس کیا ہے اور ان کی سدا بہار مسکراہٹ اس سب کا مزا دوبالا کر دیتی تھی۔

ان کی صحبت، ان کی محفل ایک عجیب کیفیت رکھتی تھی جس میں علم و ادب، نظم و نثر، فلسفہ اور تاریخ سب مل کر ایک ایسا رنگا رنگ گلدستۂ نیرنگِ خیال پیش کرتے تھے کہ ہر شخص چاہتا تھا کہ یہ منظر تادیر موجود رہے۔

آزردہ زمن حالِ شبِ وصل چہ پرسی
نے دل خبرم داشت نہ از دل خبرم بود

(آزردہ تو مجھے اس ملاقات (وصل) شب کا حال کیا پوچھتا ہے۔ نہ دل کو میری خبر تھی اور نہ مجھے دل کی)

جب کبھی ان کے ساتھ مرحوم رانا ارشاد احمد خاں موجود ہوتے تو ایک اور ہی سماں بندھ جاتا۔ پروفیسر ارشاد صاحب بہت بڑے عالم، وسیع مطالعہ رکھنے والے، اردو اور انگریزی ادب کے ماہر اُستاد، فارسی میں یکتا، فارسی کلاسیک، حافظ، سعدی اور مولانا روم نہ صرف پڑھے ہوئے بلکہ 'گُڑھے' ہوئے فلسفہ اور دنیا کی تاریخ کے شناور اور صوفی ازم کے راز دان اور پنجابی لٹریچر کے غواص تھے اور ادھر ڈاکٹر صاحب جو خود اردو، پنجابی اور انگریزی کے ادیب تھے، شاعری بھی کرتے تھے اور مارکسسٹ فلسفہ اور تاریخی مادیت اور جدلیات کے ماہر اور پھر عملی مارکسسٹ تھے۔ علاوہ ازیں حالیہ تاریخ اور حالاتِ حاضرہ پر ایک مخصوص زاویہ سے تعقلاتی تجزیہ کار اور اپنے سائنسی پس منظر کی بنا پر زندگی کے لیے ایک Rational Approach رکھتے تھے۔

اب آپ خود فیصلہ کریں کہ ان دوستوں کی محفل کیسی ہوگی اور کس سطح کی گفتگو ہوتی ہوگی اور توسنِ خیال کو کیا کیا مہمیز کا کام کرتی ہوگی۔

وہ جو فیض نے لکھا ہے:

خیال سوئے وطن رواں ہے
سمندروں کی ایال تھامے

وہ لکھا تو کسی اور پس منظر میں ہے مگر میں نے آپ کو جس محفل کا آئینہ دکھایا ہے

یقیناً ان ودیا ساگر قسم کے لوگوں کی موجودگی میں یہ محسوس کیا جاسکتا تھا کہ آپ خیال کی رتھ پر بیٹھ کر علم کے سمندر یا ودیا کے ساگر کی ایال تھامے ایک ماورائی اور Ethereal سفر پر رواں ہیں۔

اور یہ سفر آپ پر علم اور شعور کے نئے راستے کھولتا ہے۔ ایک نئی روحانی روشنی سے روشناس کرواتا ہے اور ایک نئی دنیا کا پتا دیتا ہے۔ جہاں محبت اور دلداری، انسانیت نوازی اکرام اور احسان کی بارش اور احساس اور ہمدردی کی شدت، دوسروں کے غم کو اپنا محسوس کرنے کی صلاحیت، آدمی کی زندگی کے جزولاینفک ہیں۔

آپ سمجھ سکتے ہیں کہ ان اجزا کی موجودگی میں زندگی کیسی سہل، رومان پرور اور محبت سے بھرپور ہوگی اب تو یہ محفلیں خواب لگتی ہیں لیکن ان کا نشہ اب تلک باقی ہے۔

لبت در خواب می بوسیدم امشب بوالعجب کاری
کہ مے در خواب خوردم این زماں ہستم بہ بیداری

(ترے لب تو میں نے خواب میں چومے تھے لیکن کیسا عجیب معاملہ ہے کہ مے تو خواب میں پی تھی لیکن نشہ ہنوز عالم بیداری میں چھایا ہوا ہے)

ہم جیسے لوگ جو وہاں موجود ہوتے اور ان کی گفتگو سے محظوظ ہو رہے ہوتے، کبھی کبھار محسوس کرتے کہ گو کہ بات تو مختصر ہوتی مگر اس مجلس کو جاری رکھنے کی غرض سے یا لطفِ صحبت کو دوبالا کرنے کے لیے، ایک نئی گفتگو شروع ہو جاتی اور کیفیت یہ ہوتی کہ:

بہ حرفے می تواں گفتن تمنائے جہاں را
من از ذوقِ حضوری طول دارم داستانے را

کم از کم ہماری حالت یہی ہوتی اور خواہش یہ ہوتی کہ ان دو دریاؤں کا سنگم اور روانی سے بہتا رہے اور ہمارے ذوقِ حضوری کی تسکین ہوتی رہے۔

اور بعض اوقات جب کبھی الوہی عشق کی بات چلتی تو الفاظ کا ذخیرہ ختم ہو جاتا۔

یعنی زبان، احوال کا ساتھ نہ دے سکتی۔

؎ زبان زنکتہ فرو مانند و رازِ من باقسیت
بضاعتِ سخن آخر شد و سخن باقسیت

اور خاموشی زبان بن جاتی۔

عشق کہ مرداں کشد، سفلہ نہ جوید حریف

یا:

عشق نبرد پیشہ طلب گارِ مرد تھا

عشق اپنے طلب گاروں سے، اپنے ماننے والوں سے قربانی مانگتا ہے۔ قربانی بھی کیسی؟ دل و جان کی، تمام صلاحیتوں کی حتیٰ کہ اپنی جان سے بھی عزیز تر۔۔۔ اپنے بچوں کی، ان کی خواہشات کی، ان کی امنگوں کی۔ جو شخص ایسے عشق میں مبتلا ہوا اس کی زندگی کی سادگی اور رنگینی کے کیا کہنے۔

ڈاکٹر صاحب ایک ایسے ہی عشق میں مبتلا تھے۔ وہ سیاسی طور پر جاں نثاری اور جان سپاری سے کام کرنے والے تھے۔ انہوں نے ساری عمر، سوشلزم اور مارکسزم کی تحریک میں گذاری اور دامے، درمے، سخنے، اس کی خدمت میں تندہی سے مصروف رہے۔

ایک دفعہ مجھے بتایا کہ ان کی بیگم صاحبہ نے ان سے کہا کہ توجہ سے اپنی پریکٹس کریں اور اس سیاسی اور سوشلسٹ تحریک اور مزدور کسان پارٹی کے جھنجھٹ میں نہ پڑیں۔ دیکھیں آپ کی تین بچیاں ہیں ان کے لیے کچھ کریں۔ انہوں نے جواب دیا کہ میں جو کام کر رہا ہوں وہ قوم کی تمام بیٹیوں کے لیے کر رہا ہوں اور میرے خیال میں یہ بہتر ہے۔ بہ نسبت اس بات کے کہ صرف اپنی ہی بیٹیوں کی قسمت سنوارنے کے لیے کام کروں۔

ان کی سوچ، ان کے خیال، ان کی محبت کا محور، قوم و ملک تھے اور ان کو سنوارنا، ان کا مقصد۔ ان کے طریقہ کار سے آپ کو اختلاف ہو سکتا ہے مگر ان کے اعلیٰ نصب العین

سے کوئی شخص بھی اختلاف نہیں کر سکتا۔

پاکستان میں مارکسزم، سوشلزم کی تحریک کی کہانی بہت عجیب و غریب ہے۔ یہاں ایک بنجر اور بے آب و گیاہ، ذہنی بیابان تھا۔ جب پاکستان بنا تو اس ملک میں تعلیم بہت کم تھی۔ لوگوں کی اکثریت غیر تعلیم یافتہ تھی، تعلیمی ادارے بہت کم تھے اور ملک میں صرف ایک یا دو یونیورسٹیاں تھیں۔ انڈسٹری نہ ہونے کے برابر تھی۔ مشرقی اور مغربی پاکستان ملا کر صرف دو ٹیکسٹائل ملیں، لائل پور اور اوکاڑہ میں قائم تھیں۔ ایک یا دو چھوٹے سائز کی شوگر ملیں اور چند جننگ فیکٹریز اور آئیل Expeller اور بس۔

دوسرے لفظوں میں صنعتی مزدوروں کی تعداد آٹے میں نمک کے برابر بھی نہ تھی اور ایسا گروہ جس کو Target کر کے مزدور تحریک کو منظم کرنا تھا، موجود ہی نہ تھا۔ نتیجتاً مارکسزم کا بنیادی کام، مزدوروں کی تعلیم و تنظیم ممکن ہی نہ تھا اور یہی طبقہ انقلاب کا ہراول دستہ ہوتا ہے۔

دوسری طرف سوسائٹی ایک بہت بڑے Upheaval (اتھل پتھل) کا شکار تھی۔ تبادلہ آبادی بہت بڑے پیمانے پر ہوا۔ خاص طور سے مشرقی پنجاب سے کیونکہ انگریز نے بے ایمانی سے دو تین مسلم اکثریتی اضلاع انڈیا کو دے دیے (دیکھیے Sir Redcliff کے اسسٹنٹ کی یادداشتیں جو حال ہی میں اخبارات میں چھپی ہیں۔ علاوہ ازیں چوہدری محمد علی کی کتاب Road to Pakistan)

محدود مواقع، محدود ذرائع آمدن اور ملک اور لوگوں کی معاشی کمزوری، سیاسی ابتری۔ یہ سب عوامل، طویل مشکل معاشی، معاشرتی اور سیاسی حالات کی نشان دہی کر رہے تھے۔

معاشرتی طور پر ہماری سوسائٹی کا ایک بہت بڑا حصہ پانچ ہزار سالہ پرانے قبائلی طرز پر زندگی بسر کر رہا تھا۔ یہ طرزِ معاشرت صوبہ سرحد اور بلوچستان میں تو اکثریت کا تھا۔ سندھ کا بہت بڑا حصہ اور پنجاب اور مشرقی پاکستان میں بھی کافی بڑی Tribal belts تھیں۔ پنجاب میں خاصے بڑے اور مشرقی پاکستان میں نسبتاً چھوٹے قبائلی علاقے تھے۔

سوسائٹی کے عمودی اختلافات، سنی، اہلِ حدیث، دیوبندی، شیعہ وغیرہ کی فرقہ بندیاں اور ذات پات اور Caste System کے بندھن، اس سوسائٹی کے ارتقا میں سب سے بڑی رکاوٹ کا باعث تھے اور مستقبل میں بھی سوسائٹی کو آگے کی طرف بڑھنے سے روکنے اور اسے ایک حالتِ جمود میں رکھنے کا عمل سرانجام دینے والے تھے۔

اس صورتِ حال سے نپٹنے کے لیے سیاسی قیادت از فرق تا قدم مفقود تھی۔ ایک نئی قائم شدہ مملکت کے تقاضوں کے برخلاف بیوروکریسی اور دوسرے ادارے بہت کمزور اور بے ایمان تھے اور اس نئی افتاد کے لیے بالکل نا اہل، ناقص اور نامکمل۔

سیاسی قوتیں موجود تو تھیں مگر ان میں قومی ڈھانچہ کسی میں بھی موجود نہ تھا۔ حکومتی جماعت کی ساخت اور پرداخت ابتدائی نوعیت کی تھی۔ اختلافِ رائے کو غداری پر محمول کیا جانا روزمرہ کا نعرہ تھا۔ ان کی سوچ اتنی ناقص تھی کہ وہ اپنی حکومت کو سرکارِ دولت مدار کے مترادف گردانتے تھے۔

ان حالات میں کسی بھی بائیں بازو کی سوچ کا پنپنا کتنی مشکل بات ہوگی اس کا اندازہ لگانا مشکل نہیں۔ اس کے ساتھ ساتھ جو لوگ پاکستان میں سوشلزم اور مارکسزم کا جھنڈا اٹھا کر چلے، ان پر روسی اور ہندوستانی ایجنٹ کا لیبل لگا دیا گیا۔ ان میں سے چند واقعی، پاکستان کی قومی سوچ (جو ابھی تک تشکیلی مرحلے میں تھی) سے متفق نہیں تھے یا وہ اس کو اختیار نہ کر سکے۔ لیکن ان میں کچھ بہت بڑے لوگ بھی تھے جو اپنا سب کچھ تج کر، آرام کی زندگی چھوڑ کر، مزدوروں میں کام کرنے، ان کے ساتھ زندگی گزارنے اور ان مزدوروں کے علاقوں میں رہ کر ان کو تعلیم دینے کا کام کرنے والے تھے۔ یہ مخلص کارکن بہت کم تعداد میں تھے اور حکومت ہمہ وقت ان کو زیرِ نگراں رکھتی تھی اور ہراساں کرتی رہتی تھی۔ گو کہ یہ Dedicated لوگ ان مشکلات میں اپنا کام بہرصورت جاری رکھے ہوئے تھے۔ مگر ان کی کم تعداد اور معروضی صورتِ حال ایک بہت کٹھن، طویل اور مشکلات سے بھرپور جدوجہد

کی نشان دہی کر رہی تھی۔

مندرجہ بالا بہت سے عناصر، سوشلسٹ تحریک کی اٹھان سے پیشتر ہی اس کو ہمیشہ کے لیے ختم کرنے میں اپنا رول ادا کرنے والے تھے۔

ان حوصلہ شکن حالات اور معروضی تجزیہ کے بعد، ان گنت مشکلات کے باوجود بائیں بازو کی تحریک کو جاری رکھنے اور پھلنے پھولنے کے لیے مواقع پیدا کرنے میں جاں نثار کارکنوں نے انتھک کام کیا اور حتیٰ کہ اپنی جانیں بھی قربان کر دیں۔ انہی میں ڈاکٹر مقبول کا نام بھی شامل ہے۔ وہ اس سوشلسٹ تحریک کے کارکن اور اس قبیلہ سرفروشاں کے رکن رکین تھے۔

بہرصورت معاملات اتنے آسان نہ تھے اور کارکن بھی کمیتی اور کیفیتی لحاظ سے کافی کمزور تھے۔ یہ حالات پاکستان میں جاری تھے کہ مارشل لاؤں کی یلغار شروع ہوگئی اور انہوں نے سیاسی عمل کو روک کر برادری ازم، فرقہ پرستی اور قبائلی اختلافات کو ہوا دی جس سے اصولی سیاسی اور افقی تضادات کا عمل کمزور ہوا۔ یہ حالات تھے جب ۱۹۶۰ء کی دہائی میں میجر اسحاق محمد نے مزدور کسان پارٹی کی داغ بیل ڈالی۔

ڈاکٹر مقبول اختر ۱۹۶۳ء میں نشتر میڈیکل کالج سے فارغ التحصیل ہونے کے کچھ عرصہ کے بعد ۱۹۶۴ء میں مسقط چلے گئے اور وہاں سے ۱۹۶۶ء میں واپس آئے۔ وہاں سے کچھ پیسہ لائے تھے جسے اپنے والد صاحب کو مکان بنانے کے لیے دے دیا۔

ڈاکٹر صاحب نے میجر اسحاق کے ساتھ مل کر پارٹی کا کام شروع کر دیا اور ان کے ساتھ ایک Committed ورکر کے طور پر شامل ہو گئے۔ تھوڑے عرصے کے بعد، ان کو پارٹی کارکنوں کی تربیت، تعلیم اور پارٹی سرکلر کی تدوین، تالیف اور اشاعت کا کام سونپ دیا گیا۔ جسے انہوں نے نہایت خوش اسلوبی سے سرانجام دیا۔ ان کی ادارت کے دوران پارٹی سرکلر باقاعدہ شائع ہوتا تھا اور اس میں بلند پایہ مضامین تجزیے اور اداریے چھپتے تھے۔ قارئین کی رائے، بحث مباحثہ اور باقاعدہ نکتہ چینی اور خود احتسابی سرکلر کو ایک جیتی جاگتی اور زندہ دل

دستاویز بناتے تھے۔

ڈاکٹر صاحب کی خوش طبعی ان کی عادت کا خاصہ تھی۔ کبھی کسی کی دل آزاری نہ کرتے بلکہ الفاظ کے علاوہ ان کی حرکات وسکنات سے بھی کسی کی دل شکنی کی بجائے اس کی حوصلہ افزائی ظاہر ہوتی۔ اگر محفل میں کسی نے کوئی شعر غلط پڑھ دیا یا لفظ غلط استعمال ہو گیا تو فوری غلطی نہ پکڑتے۔ اوزان وبحور پر ان کو قدرت حاصل تھی۔ خاص طور پر شعر کو وزن کے مطابق مصرعوں میں الفاظ کی نشست صحیح رکھتے۔ بہت مرتبہ تجربہ ہوا۔ جب ان سے شعر کے متعلق درخواست کی تو بہت سلیقے سے اساتذہ کے اشعار برمحل پڑھ دیتے۔ میری فارسی کی شدھ بدھ نہ ہونے کے برابر ہے۔ کیونکہ میں نے سکول کے زمانے میں فارسی کی بجائے عربی پڑھی تھی۔ (جی ہاں ایک وقت تھا جب سکولوں میں فارسی کی تعلیم باقاعدہ نصاب میں شامل تھی) میں کبھی کبھی کسی فارسی شعر کا متن، ان سے اُردو میں بیان کرتا تو فوراً فارسی شعر عنایت فرماتے بلکہ بعض اوقات ہم معنی عربی، اردو یا پنجابی کا شعر بھی سنا دیتے۔

ان کی اردو اور پنجابی میں استعداد تو کافی مشہور ہے کیونکہ وہ ان دونوں زبانوں میں نثر بھی لکھتے تھے اور باقاعدہ شاعری بھی کرتے تھے اور ادبی حلقوں میں بہت پسند کیے جاتے تھے۔ اس کے علاوہ ان کی عربی زبان میں استعداد اور فارسی پر دسترس ہمارے حلقہ دوستاں میں بہت معروف تھی۔ خاص طور پر فارسی میں حافظ، مولانا روم، سعدی، اقبال اور دوسرے اساتذہ کے اشعار از بر تھے اور موقع بہ موقع، ان اشعار کا برمحل استعمال ان کی تحریر اور تقریر دونوں کو نہایت دلپذیر بنا دیتا تھا۔ جیسے کہتے ہیں نا کہ وہ ان اشعار کو اپنی گفتگو میں نگینے کی طرح جڑ دیتے تھے۔

ان کو گفتگو کا فن خوب آتا تھا۔ دوسرا شخص سمجھتا کہ ڈاکٹر صاحب صرف اس کی باتیں سننے کے لیے آئے ہیں اور ان سے لطف اندوز ہو رہے ہیں اور نہایت سادگی، دلبستگی اور انہماک سے سن رہے ہیں لیکن جب محفل برخاست ہوتی تو وہ شخص سراپا سپاس ہوتا کہ وہ

ڈاکٹر صاحب سے بہت کچھ سیکھ کر اٹھا ہے اور دوسری ملاقات کا جویا ہوتا، بلکہ کچے دھاگے سے کھنچا چلا آتا اور جو کیفیت ہوتی، آپ اندازہ کر سکتے ہیں کہ وہ 'کہا کیے اور ہم سنا کیے' والی ہوتی۔ بہ الفاظِ فراز:

؎ سنا ہے بولے تو باتوں سے پھول جھڑتے ہیں
یہ بات ہے تو چلو بات کر کے دیکھتے ہیں

باتیں تو بہت کرنے کی ہیں، یادوں کی کڑیاں ملتی جا رہی ہیں، مگر دل کی تسلی نہیں ہوتی۔ وہ مسکراتا ہوا چہرہ اب تک دل کے آئینہ میں نقش ہے اور یوں لگتا ہے کہ ابھی آموجود ہوں گے اور کہیں گے۔

"کی حال اے؟ سر جی!"

؎ داغ فراقِ صحبتِ شب کی جلی ہوئی
اِک شمع رہ گئی "تھی" سو وہ بھی خموش ہے

اور

؎ ہر ایک مکاں کو ہے مکیں سے شرف اسدؔ
مجنوں جو مر گیا ہے تو جنگل اُداس ہے

ان کی زندگی کا عکس اس شعر میں موجود ہے۔

؎ ہم سے عبث ہے گمانِ رنجشِ خاطر
خاک میں عشاق کی غبار خاطر نہیں ہے

000

— محمد ادریس —

دبا کے قبر میں سب چل دیئے دُعا نہ سلام
ذرا سی دیر میں کیا ہو گیا زمانے کو (قمر جلالوی)

یہ 1967ء کی بات ہے کہ میرا تعارف جناب ڈاکٹر مقبول اختر سے ہوا۔ دُکھ یا تکلیف کسی درجہ کی ہو، ڈاکٹر کو میں نے ہمیشہ مسکراتا پایا۔ انھوں نے زندگی کا ایک بڑا حصہ غموں میں گزارا مگر دُکھ عیاں نہ کیا۔ ان دنوں لائل پور کچہری بازار میں ایسٹرن میڈیکوز کے نام سے ادویات کی ایک دوکان تھی جو اب بھی ہے۔ ایسٹرن میڈیکوز کے مالک محمد اسلم قریشی صاحب ڈاکٹر کہلاتے تھے یہ سمجھ میں نہیں آیا کہ اسلم صاحب میں وہ کیا مقناطیسیت تھی جو پڑھے لکھے لوگ ان کی طرف کھنچے چلے آتے تھے۔ اسلم صاحب بڑے تھے اور اکثر دوستوں کے بڑے چھوٹے کام میں ان کا مشورہ مفت ہوتا تھا مشاورتی حوالہ سے شادی بیاہ کے معاملہ میں اسلم صاحب کی خاص پہچان تھی۔ اسلم صاحب کا حوالہ بہت ضروری تھا کیونکہ یہ میرے اور ڈاکٹر مقبول اختر کے تعلق کا اصل سبب تھے۔

ڈاکٹر مقبول اختر کی ملاقات کے ساتھ اس بات کا بھی علم ہوا کہ وہ گلبرگ میں شام کو کلینک کرتے ہیں جب کہ صبح محمدی فاؤنڈیشن میں فری ڈسپنسری میں وقت دیتے ہیں پھر ان

سے ہمارے تعلقات بڑھتے چلے گئے اکثر اوقات محمدی فاؤنڈیشن میں جا کر ان سے ملنا، شام کو کلینک پر ملنا اور اس سے بڑھ کر مقبول فیملی سے ایسا تعلق ہو گیا کہ شیر سنگھ والا ہماری فیملی کا جانا ایک معمول بن گیا تھا اور اِسی طرح ڈاکٹر کی فیملی کا شاید سب سے زیادہ ہم سے تعلق تھا۔

ڈاکٹر مقبول اختر سے تعلق ان کی ''دانشوری'' نہ تھی وہ پیار کرنے والے اور دُکھ درد بانٹنے والے ایک اہم ساتھی تھے۔ ڈاکٹر مقبول نے کئی سال لگاتار ہمارے ساتھ کرکٹ کھیلی اور ہمارے کلب کے صدر بھی رہے۔ ان کے احسانات جو ہم پر رہے وہ ناقابلِ بیان ہیں۔ ذاتی طور پر ڈاکٹر مقبول اختر نے میری اس خواہش کو قابل بنا کر چھوڑا کہ میں ایک ''معیاری'' کرکٹ کمنٹیٹر بن گیا۔ ڈاکٹر مقبول اختر اور ڈاکٹر احسان الحق نے میرے کرکٹ کمنٹیٹر بننے میں مفید مشورے دیئے اور کمنٹری سن کر اس کی اصلاح بھی کی۔ ہم جیسے بے قد لوگوں کو دراصل ڈاکٹر مقبول اختر کے اصل قد کا علم نہ تھا۔ ان کے عالم ہونے کا احساس اُن محفلوں میں روشن ہوا جن میں ڈاکٹر احسان الحق، پروفیسر رانا ارشاد اور پروفیسر اشفاق بخاری شامل ہوتے تھے۔ پھر پاکستان کے بڑے اخباروں میں ڈاکٹر مقبول اختر کے کالم شائع ہونے لگے جو دوستوں کو خوشی سے فراہم کرتے تھے۔ ''قومی تشخص کا بحران'' حلقہ اربابِ ذوق لاہور میں پیش کیا۔ بڑی داد ملی جس عرق ریزی سے ڈاکٹر مقبول اختر نے یہ مضمون تخلیق کیا تھا۔ اس کی پورے پاکستان میں پذیرائی ہوئی۔ Burney صاحب جو ڈان کے ایڈیٹر تھے انھوں نے ایک خط میں اُن کی صلاحیت کا اس طرح اعتراف کیا کہ میں نہیں جانتا کہ آپ اپنے اصل شعبۂ خدمت میں یعنی ڈاکٹروں میں کیسے ہیں۔ یہ بات یقینی ہے کہ آپ سے اچھا میں نے کسی کو انگریزی میں مضمون لکھتے کم ہی دیکھا ہے۔ ڈاکٹری میں دُشواری ہو تو ''لکھنے والے'' کی حیثیت سے آپ کی ہمیشہ مانگ ہے۔

یہ کتنی اطمینان کی بات ہے کہ ڈاکٹر مقبول اختر کے توسط سے اچھے اچھے صاحب علم لوگوں سے تعارف ہوتا رہا۔ اُردو، انگریزی، فارسی، عربی، سنسکرت، ہندی، پنجابی میں

زبان و بیان کی "صحت" کا ٹھیک علم حاصل کرنا ہو تو بڑے اعتماد سے آپ ان سے رجوع کر سکتے تھے۔ یہ بات بہت اچھے تعلقات ہونے کے باوجود "طے" تھی کہ وہ جس نظامِ معیشت کو دیکھنا چاہتے تھے اس سے نالائق طالبِ علم کی حیثیت سے میرا کوئی تعلق نہ تھا میں نے ان کے بہت قریب ہو کر بھی مزدور کسان پارٹی کی سرگرمیوں سے اپنے آپ کو الگ رکھا۔

ڈاکٹر مقبول اختر کا جب برین ہیمرج ہوا، اور ان کے بولنے، سننے کی صلاحیت متاثر ہوئی وہ بڑا تکلیف دہ دور تھا ایک ایسا شخص جو ہر محفل کی جان اور بہت کام کرنے والا تھا وہ مجبور اور بے بس ہو کر رہ گیا۔ اسی دوران مَیں اپنی بیگم کے ہمراہ اپنی بیٹیوں کے پاس کینیڈا چلا گیا اور میں اُن کے آخری وقت اور آخری رسومات میں شامل نہ ہو سکا، جس کا مجھے ساری عمر افسوس رہے گا۔

خدا ڈاکٹر صاحب کی مغفرت فرمائے۔ آمین

000

ڈاکٹر مقبول اختر

۔سیّد افسر ساجد۔

ڈاکٹر مقبول اختر ایک مہذب انسان اور بالغ نظر ادیب و ناقد تھے۔ ڈاکٹری کے پیشے سے وابستگی کے باوصف وہ ادبی سرگرمیوں کے لیے وقت نکال لیتے تھے۔ ڈاکٹری میں بھی انہوں نے سائیکاٹری جیسے چیلنجنگ شعبے کو بطور پروفیشن اپنایا۔ یہ ان کی مہم جو طبع کی دلیل ہے۔

ڈاکٹر مقبول اختر کو اردو اور انگریزی دونوں زبانوں پر یکساں عبور حاصل تھا۔ ان کے تنقیدی رجحانات اگرچہ انقلابی نوعیت کے تھے لیکن وہ اپنے قلم کی جولانی کو 'حدِ ادب' سے متجاوز نہیں ہونے دیتے تھے۔ ان کو ادب سے گہرا لگاؤ تھا اور وہ ادب میں جدّت تنوّع اور نظریہ سازی کے پرزور پرچارک تھے۔

ڈاکٹر موصوف سے اگرچہ راقم کا Interaction اتنا زیادہ نہ تھا، لیکن ہم ایک دوسرے کا انتہائی احترام کرتے تھے۔ وہ انسانی قدروں کے بے حد فعال علم بردار تھے۔ ادبی محافل میں اکثر بڑے شوق سے حصہ لیتے تھے اور مباحث میں ان کا رویہ جوش اور ہوش کے خوبصورت اعتدال پر مبنی ہوتا تھا۔ وہ ادبی اور سماجی تقریبات کی جان تھے۔ ڈاکٹر مقبول اختر

ایک باا ثر مگر انتہائی شریف خانوادے سے تعلق رکھتے تھے۔ خوش خلقی، خوش گفتاری اور خوش لباسی، ان کی ذات کا اختصاص تھا۔ ان کو ادب کی خاص سوجھ بوجھ اور پرکھ تھی۔ اپنی ہمشیرہ منزہ سلیم کی دل جوئی اور ادبی تربیت میں ان کا بڑا ہاتھ تھا۔

موت برحق ہے، لیکن ڈاکٹر مقبول اختر کی موت نے فیصل آباد کی ادبی زندگی میں جو خلا پیدا کر دیا ہے شاید اسے برسوں پُر نہ کیا جا سکے۔

ع حق مغفرت کرے عجب آزاد مرد تھا!

ooo

A Tribute to Dr. Nana

–Asbah Asim–

میری دس سالہ بڑی نواسی اصبح عاصم نے اپنے ڈاکٹر نانا کو خراجِ تحسین پیش کیا ہے اور مجھ سے بہتر انداز اور بہتر الفاظ میں انہیں Portray کیا ہے۔ (مصنفہ)

His voice was like music in my head,
His smile was like a healing medicine on the heart,
But this world never let him hold on tight,
In other words this is life,
He did'nt get a second chance to hold everyones hand;
Kiss their head and hug them once again,
Now he is the past that we can't forget,
For he is in our heart, like the first ray of light in the morining,
The first drop of rain, the first flower of spring and the last of autumn,
He was like the kiss of a mother on a child's head when he can't sleep,
The hug of a father when a daughter is scared; He was like warm love,
If anyone asks me what I would wish, if, I had one,
I would wish him to be happy,
And ask Allah to give him a place in heaven, for he deserved it.

ooo

Dr Maqbool Akhtar
A Scintillating Personality

–Brig Asif Haroon–

I met Dr Maqbool Akhtar for the first time in February 1998 on the occasion of marriage of his niece Hania, daughter of Munaza Salim, at Faisalabad. I had gone there since DrMaqbool and Munaza are close relations of my wife. My wife used to talk a lot about him. In her view he was exceptionally intelligent, literary, forgiving, well dressed, friendly and handsome person. He had specialized in psychiatry.

I remember, on our very first meeting, within no time Maqbool sahib made me at home. I found him to be open hearted, jovial and a scintillating personality, and above all very knowledgeable, kindhearted and humane. He was very popular in the whole family irrespective of age group and was well respected. He had a positive

approach towards life and loved his wife, children and his brothers and sisters. He fitted into the picture drawn by my wife. He impressed me a lot.

I met him one more time in person,otherwise we occasionally used to talk to each other on phone. I was deeply saddened to hear the news of his death. Owing to his sterling qualities of head and heart, he will be fondly remembered by all those who were very close to him as well as his acquaintances.

I pray for the departed and also pray that may Allah grant strength to his family members to bear this irreparable loss.

I commend Munazza for writing a book in memory of her late brother DrMaqbool. It manifests her emotional attachment with her brother.

OOO

''ماما جی'' دا ''بولی''

—چوہدری طفیل محمد (ماموں)—

(یہ میرے آخری حیات ماموں ہیں۔ خدا انہیں سلامت رکھے۔ یہ میجر اسحاق صاحب سے چھوٹے ہیں۔ مصنفہ)

لائی حیات آئی قضا لے چلی چلے
اپنی خوشی نہ آئے نہ اپنی خوشی چلے
بہتر تو ہے یہی کہ نہ دنیا سے دل لگے
پھر کیا کریں جو کام نہ بے دل لگی چلے

انسان جب دنیا سے چلا جاتا ہے تو اس کی باتیں یاد رہ جاتی ہیں۔ اس کی یادیں پل پل خون کے آنسو رلاتی ہیں۔ ہمارے درمیان سے ایک بہت محبت کرنے والا انسان چلا گیا ہے۔ وہ میرا بھانجا تھا، میری سب سے بڑی بہن کا بیٹا 'ڈاکٹر مقبول اختر' میرا بہت ہی لاڈلا بھانجا۔۔۔ میرا 'بولی' جس کی باتوں اور یادوں کا خزانہ کبھی ختم نہیں ہوگا۔

مقبول یوں تو سب ہی سے محبت کرتا تھا مگر مجھ سے اس کو ایک خاص انسیت تھی۔

یہ پاکستان بننے سے پہلے کی بات ہے میں اور میرا چھوٹا بھائی فتح محمد (ڈاکٹر فتح محمد چوہدری

سابق پرنسپل پنجاب میڈیکل کالج فیصل آباد) لاہور، بی بی جی (والدہ ڈاکٹر مقبول اختر) کے پاس گئے ہوئے تھے۔ مجھے اگلی صبح واپس گاؤں جانا تھا۔ میں نے رات کو ہی بھائی صاحب (والد ڈاکٹر مقبول اختر) اور بی بی جی سے واپسی کی اجازت لے لی تھی۔ مقبول بھی اس وقت وہیں موجود تھا۔ چپکے سے ہماری باتیں سنتا رہا۔ رات کو میرے ساتھ ہی سویا۔ میں نے بھائی فتح محمد سے شام کو ہی کہہ دیا کہ جب صبح میں اُٹھوں تو میرے بستر پر مقبول کے ساتھ لیٹ جائیں، تاکہ اس کی نیند خراب نہ ہو۔ مجھے صبح جلدی اٹھنا تھا کیونکہ گاڑی فجر کی اذان سے ڈیڑھ گھنٹہ پہلے روانہ ہوتی تھی۔

صبح تہجد کے وقت میں اُٹھا اور بھائی فتح محمد کو اشارے سے بلایا لیکن جیسے ہی میں اٹھا، مقبول بھی جاگ گیا اور اٹھ کر بیٹھ گیا اور بولا:

''ماما جی''

اس کے لہجے میں جو محبت چاشنی اور تڑپ تھی مجھ سے رہا نہ گیا۔ میں نے بے اختیار اسے گلے سے لگا لیا اور اسے ساتھ لے کر سٹیشن کی طرف چل پڑا۔ گاڑی آنے تک پلیٹ فارم پر بیٹھا میں اس کی چھوٹی چھوٹی باتیں سنتا رہا گاڑی نے ہمیں سورج نکلنے سے پہلے کرتار پور پہنچا دیا۔ سٹیشن سے گاؤں تک کا پیدل راستہ تھا۔۔۔ ریتلا۔ میں نے مقبول کو اپنے کندھوں پر بٹھا لیا اور وہ مجھ سے میٹھی میٹھی باتیں کرتا رہا۔

''ماما جی، دیکھیں نا، ادھر اتنے درخت ہیں اور ادھر اتنے۔''

اور پتا ہی نہ چلا، کب ہم گھر پہنچ گئے۔

مقبول، بچپن ہی سے، بہت خوددار تھا۔ آپ کو ایک واقعہ سناتا ہوں۔

بڑے بھائی صاحب (چوہدری غلام رسول، والد مقبول اختر) چھٹیوں میں بچوں کو میرے پاس بھیج دیتے تھے۔ ہمارا مکان خاصا بڑا تھا۔ دیوان خانے کے سامنے ایک بہت بڑا خالی پلاٹ تھا جسے 'تھڑا' کہتے تھے۔ یہ ساری برادری کا مشترک تھا۔ میرے تایازاد بھائی،

علی محمد کا معمول تھا کہ وہ روزانہ بچوں کے لیے کوئی نہ کوئی چیز ضرور لاتے۔ ایک دن بہت اچھی قسم کے بیر لائے۔ وہ جھولی میں بیر بھر کے 'تھڑے' پر آئے اور کہنے لگے کہ جن بچوں نے بیر کھانے ہیں آجاؤ۔ انہوں نے بیروں کا 'چھٹا' دیا تو سب بچے بیر اٹھانے کے لیے بھاگے مگر میرا پیارا 'بولی' بہت آرام سے بیٹھا رہا۔ بھائی صاحب خود اس کے پاس بیر لے کر آئے اور کہنے لگے:

"مجھے پتا تھا، مقبول بہت خوددار ہے وہ بیر چننے کے لیے نہیں آئے گا۔"

جب وہ جنوری ۲۰۱۰ء میں ہسپتال داخل ہوا تو میں اسے دیکھنے کے لیے گیا۔ میں نے اس کا منہ چوما تو اس نے بھی میرا منہ چوم لیا۔ کچھ دیر میں بیٹھا رہا، جب اٹھ کر کھڑا ہوا تو بہت حیرانی سے کہا،

"چلّے؟"

اس وقت مجھے جو صدمہ ہوا وہ بیان نہیں کیا جا سکتا، مگر مجبوری تھی زیادہ لوگ ٹھہر نہیں سکتے تھے۔

اس کے رخصت ہو جانے سے کچھ عرصہ پہلے، میں اسے ملنے کے لیے زرقا کے گھر گیا۔ منزّہ بھی وہیں تھی۔ مجھے دیکھا تو کہا:

"اوہو، ابا جی آئے نیں۔"

پھر اٹھ کر تیز تیز چل کر دکھایا۔ مقصد میری پریشانی کو کم کرنا تھا۔ منزّہ نے بمشکل پکڑ کر انہیں صوفے پر بٹھایا۔

میرا بھانجا مقبول اختر، ایک خوش رو خوش لباس انسان تھا۔ اس کے چہرے پر خوبصورت مسکراہٹ، ازل سے لے کر ابد تک جگمگاتی رہی۔ دعا ہے کہ وہ اگلی دنیا میں بھی ایسے ہیں مسکراتا رہے۔

○○○

اخترِ مقبول

—خالد محمود خان—

وہ صرف خواب یا خیال ہی نہیں تھا، جیتی جاگتی حقیقت بھی تھا۔ مقبول اختر، دراصل اخترِ مقبول تھا۔ وہ ستارے کی طرح چمکا کچھ دیر 'اُفق' پر ٹھہرا 'حیات کو حیرانی سے دیکھا اور کسی دوسری منزل کی طرف سفر کر گیا۔ جاتے جاتے وہ میری کتاب "یادِ یارِ مہرباں" کا دیباچہ لکھ گیا۔ یہ کتاب بھی اس کی طرح کے کسی مقبول ستارے سے متعلق ہے۔ شاید وہ اپنا ہی دیباچہ لکھ رہا تھا۔

اُس نے مجھے زندگی کی ایک بے حد پُرانی اور اُس سے بھی زیادہ عزیز یاد کی خواب وادی میں اُتار دیا۔ میں لگ بھگ چار پانچ برس کا ہوں گا جب سے میں اس خواب سی یاد کو ہر وقت تازہ کرتا رہتا ہوں۔ ہمارا گھر گاؤں سے تقریباً باہر کے کونے پر تھا۔ اُس سے آگے کوئی اور گھر نہیں تھے۔ گھر سے باہر دور تک زمین پر چھوٹی چھوٹی جھاڑیاں یا اِکا دُکا درخت دکھائی دیتے تھے۔ گھر کے صحن میں شہتوت کے دو درخت تھے۔ وہ دونوں قد کاٹھ اور اپنے تن و توش میں بالکل ایک جیسے لگتے تھے۔ میں سمجھتا تھا وہ دونوں بھائی بھائی ہوں گے۔ میرے

خیال میں انسانوں اور درختوں کے رشتے ایک ہی طرح سے بنتے اور نباہے جاتے تھے۔ مجھے یہ اندازہ نہیں تھا کہ انسان، درختوں کے علاوہ بھی بہت سی چیزوں کو اپنی طرح محسوس کرتے ہیں۔ میری والدہ اُن دونوں درختوں کے درمیان کھڑی ہو جاتیں اور شمال کی طرف کے کسی ستارے کو دیر تک تکتی رہتیں۔ میں اُن سے لپٹا رہتا اور خاموشی سے اپنی والدہ، درختوں اور ستاروں کو دیکھتا رہتا۔ میرا دل ماں، رات، ستارے، درختوں، خاموشی اور سُکھ سے بھر جاتا تھا۔ میں ایسے میں کبھی خوش کبھی اُداس اور کبھی حیران ہوتا رہتا۔ مجھے اس بات کا خیال کبھی نہ آیا کہ اپنی ماں سے اپنی حیرانی کی بات کے متعلق کوئی سوال پوچھ لوں۔ یا، شاید مجھے ایسا کرنے کی ضرورت ہی نہیں تھی۔ ماں اُس ستارے کو کبھی چاند کی موجودگی میں دیکھتی اور کبھی ستارے کو اس کی اپنی تنہائی کے ساتھ۔ مجھے وہ ستارہ کبھی نظر نہ آیا۔ وہ میرے لیے بہت سے ستاروں کے جھرمٹ میں چھپ جاتا تھا اور میں اسے کبھی تلاش نہ کرتا۔ میرے لیے اُس کے ہونے یا نہ ہونے کا تعلق ماں کی موجودگی سے تھا اور بس۔

جب ماں رُخصت ہوئی تو نہ مجھے درخت بھائی بھائی لگتے تھے نہ اُن دونوں کے درمیان میری ماں کی وہ زمین اور کائنات نظر آتی تھی جہاں وہ کھڑی ہو کر شمال کے ستارے کو دیکھتی تھی یا شاید اُس سے باتیں بھی کرتی تھی۔

میرے لیے رات، درخت، ستارہ اور چاند وہی تھی۔ اس کے بعد نہ میں نے چاند کو ڈھونڈا نہ ستارے کو۔

میرا یہ رویہ ہمیشہ ایسا ہی رہا۔ مجھے اس پر کبھی حیرانی نہ ہوئی اور نہ میں نے اپنے آپ سے کبھی سوال، جواب کیا۔ مجھے ہجر اور حقیقت پر ایک ہی چیز ہونے کا یقین ہو گیا تھا اور کبھی اس پہ شک بھی نہیں گزرا۔

ڈاکٹر مقبول اختر کے کلینک کے اِرد گرد دستیانہ روڈ پر بہت سے کلینک تھے جہاں لائل پور کے فیصل آباد میں بہت سے ڈاکٹر مریضوں کا علاج معالجہ کرتے تھے۔ میرا بھائی

عابد خان ٹی بی ہونے کی شکایت لے کر آیا تو میں اسے ایک نوجوان ڈاکٹر کے پاس لے گیا۔ اُس نے بھائی کو تو تندرست کر دیا البتہ مجھے ڈاکٹر مقبول اختر کی محبت کا خوبصورت روگ لگا دیا۔ پروفیسر اشفاق بخاری کی موجودگی نے مقبول اختر کے ساتھ میرے تعلق کو نہ صرف آسان کر دیا بلکہ گہرا بھی۔ اس کے بعد ہم تینوں ایک تکون تھے ہم تینوں اپنے اپنے دائروں میں بھی رہتے اور اپنی تکون سے کبھی باہر بھی نہ نکلتے۔ ہمارے درمیان کتابیں، فکری آزادی، غیر جانب دارانہ تجزیہ، عوام اور معیشت کے تعلق، باہمی اقدار کی طرح تھا۔ پاکستان عوام اور معیشت کے متعلق مقبول اختر کے خیالات بے حد غیر روایتی تھے۔ اس کا تجزیہ تھا کہ پاکستان بننے کے فوراً بعد ہی اقتدار کے لیے سیاسی راستہ بھی آمریت سے مختلف نہ تھا۔ اقتدار کے چہرے پر خوش حال طبقہ کے نقوش سجے تھے اور وہی پاکستان کا نمائندہ چہرہ تھے۔ عوام کہیں بہت پیچھے اور دُور رہ گئے تھے۔ ترقی، خوش حالی اور فتوحات اور ''اندرونِ مُلک فتوحات'' کا غازہ ریاست کے چہرے پر اس قدر گہرا ہو گیا کہ عوام کے چہرے کی لکیروں میں لپٹی ہوئی تحریروں کو کوئی نہ پڑھ سکتا تھا۔ وہ کہتا تھا کہ کھیت کی گندم کا مالک کوئی اور ہے اور گندم اُگانے والے کسان اُس کھیت میں سے اضافی جڑی بوٹیوں پر گزر بسر کرتے ہیں یا گندم کی ٹوٹی، بکھری بالیاں (ڈڈھ) چنتے رہتے ہیں۔ عوام کی حیات کا انحصار ''کسان ثقافت'' پر ہے جو آپس میں دودھ، آٹا، گُڑ اور جانور، اشیاء اور اثاثوں کی طرح مشترک رکھتے ہیں۔ آنے والا زمانہ تجارت Commerce کا ہو گا جس کے نتیجے میں عوام ''کسان ثقافت'' کے فیضان سے بھی محروم ہو جائیں گے۔ ایسا اس لیے ہو گا کہ ''کسان ثقافت'' صنعت اور تجارت کی وجہ سے بے چہرہ ہو جائے گی مگر اس کی کسی متبادل ثقافت کی کوئی نیکی وُرود پذیر نہیں ہونے دی جائے گی۔ اس سے اقتدار اور معیشت کا اغوا کار طبقہ ناقابلِ تلافی نقصان پہنچائے گا اور لوگوں نے پاکستان کی آرزو نقصان اُٹھانے کے لیے تو نہیں کی تھی۔ معاشرتی رشتوں سے ''معاشرتی معاہدہ Social Contract'' کا تقدس خوشبو کی طرح اُڑ جائے گا۔ معاشرے

میں تشدد اور جرائم میں اضافہ، بے رحمی، ناانصافی، مایوسی، قتل اور خودکشی کی شرح میں اضافہ ہو جائے گا۔ تجارت اور پیسے کی گنتی کی وجہ سے عوام کے درمیان سے "کسان ثقافت" کی محبت، اعتبار، اعتماد، انحصار، تعاون اور فیضان اغواء ہو کر بینکوں کے کھاتوں میں چلے جائیں گے۔ اس ثقافت کی کسی متبادل ثقافت کو اس زمین پر کوئی نہ اُترنے دے گا۔ اغوا کار اپنے لیے اپنی معاشی اور سیاسی ثقافت بنائیں گے۔ اس ثقافت کا عوام سے آقا اور غلام، مالک اور نوکر، امیر اور غریب، منصف اور ملزم، سپاہی اور چور یا معزز اور کم ذات کا تعلق ہو گا۔ مقبول اختر کے اندازِ فکر کے پس منظر میں بہت زوردار عوامل تھے۔ وہ میجر اسحاق کا بھانجا تھا اور اُس سے، اُس کے خیالات اور سرگرمیوں سے بخوبی واقف تھا۔ یہ میجر اسحاق وہی پاکستان کا عوامی باغی ہے جس نے "مُصلّی" کو شناخت دی۔

شعر خوانی، چھیڑ خانی، لطیفہ بازی اور جملہ سازی ہماری تفریح تھی۔ اُردو، فارسی، انگریزی اور پنجابی ہماری مشترکہ زبانیں تھیں اور ان کا ادب ہمارا خزانہ۔ میں زندگی میں جتنے تھوڑے وقت میں مقبول اختر کے ساتھ روحانی بے تکلفی کے درجے پر پہنچ گیا زندگی میں ایسا "کم وقت، طویل سفر" کبھی طے نہ کیا تھا۔ بلکہ میں محبت کے سفر میں بے حد سست رفتار ہی رہا ہوں یا شاید اس سفر میں جلدی میں نہیں ہوتا۔ مقبول اختر بنیادی طور پر انسانی وجود کے تجزیہ اور علاج کا ماہر تھا مگر وہ جلد ہی اس کی دریافت مکمل کر کے ذہن، دماغ اور نفسیات کے جزیروں کی طرف چل نکلا۔ یہ میدان اس کی روحانیت تھا اور اس کے اس سفر میں کوئی قدم کٹھن نہ تھا۔ اس نے علمِ نفسیات کی رسمی تعلیم، بطورِ خاص حاصل کی تھی مگر وہ اپنی بصیرت میں ان چیزوں کا ہرگز محتاج نہ تھا۔ وہ چھوٹے چھوٹے جملوں میں خواب، خیال انسانی رویے، اُلجھن، غلط فہمی اور انسانی مزاج کی بہت ہی جامع تشریح کرنے میں خاص مہارت رکھتا تھا۔

مثال کے طور پر پنجابیوں میں مقامی یا لوکل پنجابیوں کو "جانگلی" بھی کہا جاتا ہے۔ کسی نے اپنے جانگلی ہونے سے متعلق بہت خوشی کا اظہار کیا۔ میں نے مقبول اختر سے اُس

کے رویے اور اعتماد کے متعلق معلوم کیا تو اُس نے بہت ہی پھیلی ہوئی بحث کو ایک ہی لفظ میں تشریح کر دیا "فخر" (pride) اُس آدمی کو اپنی اِس پہچان پر فخر تھا اور اُس نے اپنے اعتماد کی طاقت سے اس تحقیر آمیز تصور کو باعث فخر بنا دیا تھا۔ اپنی ذات کے یقین اور خود احترامی نے اُسے ہر قسم کی شرمندگی سے بچا رکھا تھا۔ مگر انسانی رویے اتنے سادہ نہیں ہوتے یا اگر ہوتے بھی ہیں تو اتنی آسانی سے اُن کا نکھیڑا بکھیڑا نہیں کیا جا سکتا۔ مقبول اختر اس دنیا کے ساتوں در کھول کر اُس میں جا بسا تھا۔

مقبول اختر نے بہت کچھ لکھا اور بہت خوبصورت لکھا۔ میرا خیال ہے۔ اس نے اپنی تحریروں کو کبھی کتابی شکل میں بھی پیش نہیں کیا۔ اُس کے اسلوب پر اُس کی حُسن پرستی کی چھاپ بہت واضح نظر آتی ہے۔ اُس کے اسلوب کی جمالیات اُس کے مزاج سے جنم لیتی تھی۔ وہ دیکھنے میں جتنا حسین تھا اپنے باطن میں اس سے زیادہ خوبصورت تھا۔ وہ صاحبِ جمال تھا اور "متاعِ جمال" اُس کے ماحول میں پوری آب و تاب، وفور، اور ورُود کے ساتھ موجود رہتی تھی۔ وجود اور خیال، دونوں صورتوں میں، ہر طرح کی جمالیات۔ میں اُس کے "اُس نصیب" پر رشک بھی کرتا تھا اور فخر بھی۔ اُس کے موضوعات عموماً سوانحی اور ادبی صنف "تذکرہ" یا "یادداشتوں" سے متعلق ہوتے تھے۔ یہ موضوعات بھی اُس کے پیشہ یعنی علمِ نفسیات ہی کا حصہ ہیں۔ وہ چھوٹے چھوٹے جملوں میں سمٹے سمٹائے معنی پیش کرتا تھا اور تھوڑے لفظوں میں زیادہ بات کہنے کا فن جانتا تھا۔ اُس کے خیالات پر فرائڈ، مارکس، ڈارون اور سارتر کے گہرے اثرات تھے۔ اِس کے علاوہ میر، غالب، منٹو، حافظ شیرازی، مولانا روم اور قرۃ العین طائرہ کے خیالات اُسے بے حد عزیز تھے۔ نظیر اکبر آبادی کو "بے نظیر اکبر آبادی" کہتا تھا اور اُس کا موازنہ انگریزی کے عظیم شاعر جوفری چاسر (Jeoffrey Chaucer) سے کرتا تھا۔ اُس کی سوچیں ہر قسم کے ابہام اور توہمات سے پاک تھیں۔ وہ کہاں اور کس حدِ آخر پر ختم ہوتی تھیں، اِس کی خبر بھی اُسے معلوم تھی۔

منظر اِک بلندی پر اور ہم بنا رکھتے
عرش سے پرے ہوتا کاش کہ مکاں اپنا (غالبؔ)

اِک اور دریا کا سامنا تھا منیؔر مجھ کو
میں ایک دریا کے پار اُترا تو میں نے دیکھا (منیؔر نیازی)

بخاری، مقبول اختر اور میری زیادہ تر نشستیں میرے گھر پر ہوتی تھیں۔ چناب کلب کے مخملیں سبزے پر بھی ہمارے لیے رات دیر گئے کی شبنم اُترتی تھی۔ ہماری محفل کبھی کبھی اُس کے کلینک یا گھر پر ہوتی تھی۔ البتہ بخاری کے گھر میں ہمارے لیے اس طرح کی گنجائش نہ تھی۔ ہوسکتا ہے اُس کے اپنے لیے بھی نہ ہو۔ مگر یہ باتیں ہمارے سوال و جواب کا حصّہ نہ تھیں۔ مقبول اختر اس طرح کی محفل آرائی پر چھوٹے بچوں کی طرح خوش ہوتا تھا اور ہمیں خوش رکھتا تھا۔

مقبول اختر اور بخاری اگرچہ عمر میں مجھ سے کچھ بڑے تھے مگر وہ میرے ساتھ ہم سری کے مزے لیتے تھے۔ میں اُن کی بڑائی، بزرگی، تجربہ جیسے سب خزانوں سے بھی فیض یاب ہوتا تھا۔ ہم آپس میں اس قدر فکری ہم آہنگی رکھتے تھے کہ ہمارے درمیان کسی موضوع پر کبھی بحث نہ ہوئی۔ گفتگو کسی مذاکرے کی طرح ہوتی تھی جس میں کسی ایک نکتے سے آگے کی بات چلتی تھی اور پھر اس سے آگے کی۔ سیاق و سباق نہ بدلتا تھا۔ بات ایک دوسرے کے احترام میں ہاں میں ہاں ملانے کی نہ تھی بلکہ یکساں خیالات تھے، حیران کُن حد تک۔

وہ میرے بچوں، علی خالد، عائشہ، اور احمد خالد کو ''ٹینڈے'' کہتا تھا۔ جب بھی ملتا تو سوال کرتا ''خالد تیرے ٹینڈے کیسے ہیں؟ وہ تھوڑے ہی دنوں میں آلو ہو جائیں گے اور پھر اُس کے بعد توریاں، کھیرے اور تراں (ککڑیاں) کی طرح کے نکل آئیں گے۔'' مقبول اختر کی سبزیاں واقعی بڑی ہوگئی ہیں۔ اُن میں سے ایک ''کھیرا'' برطانیہ کی مانچسٹر یونیورسٹی چلا گیا ہے اور دوسرے دونوں نے مجھے اپنے ہجر کے خوف میں مبتلا کر دیا ہے۔ میں اپنے گھر

میں اپنے لیے امرود، لیموں، ٹماٹر، بینگن، بھنڈیاں اور خربوزے اُگا لیتا ہوں۔ میں مقبول اختر اور اپنے دامن میں اُس کی سبزیوں سے ڈر گیا ہوں۔

وہ کافی عرصہ سے اچھی صحت سے نہ تھا۔ میں مقبول اختر کو دیکھنے گیا تو وہ، وہی تھا۔ مسکراتا بھی تھا اور ہنستا بھی تھا۔ چہچہاتا نہ تھا۔ اُس کی زُبان پر کم کم لفظ تھے اور چہرے پر بے شمار معنی۔ وہ بڑے ضبط سے میرے پاس کافی دیر تک بیٹھا رہا۔ اُس کا ضبط، صبر کا صحرا تھا۔ اُس کی وقفہ وقفہ سے خاموشیاں صحرا میں فاصلوں کی طرح تھیں۔

بات سے خاموشی، زبان سے سماعت، بے ساختگی سے ضبط، قہقہے سے مسکان کے سفر میں بھی ٹھہراؤ نہیں تھا۔ ہر چیز وسعت سے کمی، کی طرف جا رہی تھی۔ وہ اپنی مخصوص وضع داری سے مجھے باہر تک خدا حافظ بھی کہنے آیا۔ میں جاتے جاتے ہوئے بھی پتہ نہیں کیوں بار بار پیچھے مڑ کر اُس کو دیکھ رہا تھا اور وہ بھی وہیں کھڑا رہا۔ میں نے دوسری گلی میں مڑ جانے سے پہلے ایک بار پھر اُسے دیکھا اور فیصلہ کر لیا کہ میں مسلسل رابطے میں رہوں گا۔ خط لکھوں گا، کتابیں بھیجوں گا اور عائشہ خالد سے اس کے لیے صحت کی دُعا اور خوشی کے کارڈ بنوا کر بھیجوں گا۔ یہ وہی عائشہ ہے جو عموماً ''آشا'' کہلاتی ہے۔ میں نے پھر سے طے کر لیا کہ کم از کم مقبول اختر کے لیے مجھ سے اس کی کوئی بات میری موجودگی مانگ رہی تھی۔ اس کے باوجود میں اپنے آپ کو اُس کے حق میں کوتاہ کار لگتا ہوں۔ میں آشا کے بنائے ہوئے کارڈ کسی ادبی رسالے، مجلّے میں رکھ کر مقبول اختر کو بھیج دیتا اور پھر اگلے ہی روز میرے فون پر اس کی آواز سنائی دیتی۔ وہ آواز جسے ہمیشہ کے لیے خاموش ہو جانا تھا۔ وہ ہاتھ جسے میرے ہاتھ سے چھوٹ جانا تھا جسے میرے خط کو بھی موصول نہیں کرنا تھا اور آشا کے آخری کارڈ بھی۔

میں اس تحریر کے ساتھ مقبول اختر کے لیے آشا کے آخری کارڈ منزّہ باجی کو بھیج رہا ہوں، مقبول اختر کے نام۔ میری ماں کے پسندیدہ ستارے ''اخترِ مقبول'' کی تلاش میں۔ ان میں اُس کا پتہ درج ہے۔ وہ خواب تھا۔ وہ خیال تھا اور خواب وخیال کی حقیقت بھی۔

میری نظر میں ___ ڈاکٹر مقبول اختر

— محمد خالد مسعود قریشی —

ایک دفعہ کا ذِکر ہے کہ ہم 65 سالہ بابے بھی چھوٹے ہوا کرتے تھے۔ یہی کوئی سولہ سترہ برس کے۔ تب زندگی کو دیکھنے کا ایک ہی زاویہ ہوا کرتا تھا کہ جو بھی ہو ہماری مرضی کے مطابق ہو۔ غلام محمد آباد میں ہمارے بہنوئی رہا کرتے تھے۔ وہ شہر کے ایک مشہور ڈرگ سٹور کے مالک تھے۔ اِس وجہ سے اِن کے حلقہ احباب میں ڈاکٹرز کی تعداد نمایاں تھی۔ گول مسجد کے سامنے ایک نامعقول سی عمارت میں ایک اچھی خاصی سرکاری ڈسپنسری ہوا کرتی تھی جس میں ایک نہایت سمارٹ ڈاکٹر اور بے حد خوبصورت لیڈی ڈاکٹر لوگوں کا علاج کیا کرتے تھے۔ یقین کی حد تک پہنچا ہوا شبہ یہ تھا کہ دونوں ایک دوسرے کو پسند کرتے ہیں۔ ہم بلاوجہ دونوں کو پسند کرتے تھے۔ اُس عمر میں فلمیں دیکھنا ہماری اوّلین تفریح تھی۔ ہر جوان لڑکی ہمیں ہیروئن محسوس ہوتی۔ ہیرو اکثر ہم خود ہی ہوا کرتے تھے لیکن اِن دو ڈاکٹرز کے لیے ہم نے خصوصی فراخ دِلی کا مظاہرہ کرتے ہوئے ڈاکٹرنی کو تو ہم نے ہیروئن ہی رکھا لیکن ہیرو کے لیے خود کو بخوشی دستبردار کرتے ہوئے ڈاکٹر صاحب کو ہیرو بنا دیا۔ بلاوجہ ہماری شدید خواہش تھی کہ اِن دونوں کی شادی ہو جائے۔ ڈاکٹر صاحب سوٹ

بوٹ پہن کر اور ڈاکٹرنی صاحبہ اُس زمانہ میں ساڑھی پہن کر ہیل والی جوتی ٹکا کر جب صبح صبح ڈسپنسری آتے تو لوگ انھیں نہایت محبت بھری نظروں سے دیکھتے اور صدقے واری جاتے۔ کمال کی جوڑی تھی۔ ان دونوں کا ہماری بہنوئی صاحب کے گھر اکثر آنا جانا تھا لہٰذا ہمیں بیمار ہوئے بغیر بھی انھیں قریب سے دیکھنے کی سہولت میسر رہتی تھی۔

ڈاکٹر صاحب کی مسکراہٹ اُن کی شخصیت کو اور بھی جاذب بنا دیتی تھی۔ انھیں یقیناً اپنی اِس خوبی کا علم تھا اسی لیے حالات جیسے بھی رہے ہوں اُن کے چہرے سے مسکراہٹ سدا چپکی رہی۔

اب زندگی کوئی فلم تو نہیں کہ جس کا سکرپٹ ہم جس طرح چاہیں لکھ لیں۔ ہماری قسمت اور زندگیوں کا سکرپٹ تو اُوپر والا لکھتا ہے اور اپنی خود کی مرضی سے لکھتا ہے۔ ہوا یوں کہ گھر والوں نے ہمیں ایک عجیب وغریب 3 سالہ کورس کرنے کے لیے مونگ رسول بھیج دیا اور ہم ایک معمولی سا ڈپلومہ حاصل کرنے کے لیے اتنی دلچسپ ''لوسٹوری'' چھوڑ کر روانہ ہو گئے اور جب تین سال بعد واپس لوٹے تو ظالم سماج اپنا کام دِکھا چکا تھا اور حالات یکسر بدل چکے تھے۔ ڈاکٹر صاحب تو آپ سمجھ ہی گئے ہوں گے مقبول اختر تھے اور ڈاکٹرنی کا نام جاننے کے لیے بے تاب ہونے کی ضرورت نہیں۔ اس لیے کہ زیادہ ٹوہ میں رہنا مناسب بات نہیں ہے۔

ڈاکٹر صاحب جیسا ہمہ وقت شگفتہ آدمی میں نے تو کم از کم اپنی زندگی میں نہیں دیکھا۔ اُن کی صحبت میں کبھی میں نے کسی شخص کو مایوس، دُکھی نہیں دیکھا۔ بلکہ سنجیدہ بھی نہیں دیکھا۔ انھوں نے نفسیات کی ڈگری تو بہت بعد میں لی وہ شروع سے ہی ماہر نفسیات تھے اور سب ملنے والوں کی نفسیات سمجھتے تھے اور سب کو علیحدہ علیحدہ طریقہ سے خوش اور مطمئن رکھتے تھے۔ چھوٹے چھوٹے بروقت چٹکلے اور شگفتہ باتیں اُن پہ نازل ہوتی تھیں۔ وہ لطیفہ سنانے کا بہت ہی منفرد انداز رکھتے تھے۔ دوسرے لوگ تو اُن کے لطیفوں پر ہنستے ہی ہنستے تھے وہ

خود بھی اپنے لطیفے سے اِس طرح لطف اندوز ہوتے تھے کہ جیسے یہ لطیفہ انھیں کسی اور نے سنایا ہو۔ بلیک اینڈ وائٹ کے زمانے سے ہی رنگین مزاج تھے۔ سیاست اور ادب پر اُن کا اپنا ہی نقطۂ نظر تھا۔ ''ترقی پسند'' رجحانات کے قائل تھے اور لوگوں کو قائل کیا کرتے تھے۔ قائل ہو جانے کا سافٹ ویئر اللہ نے اُن میں ڈالا ہی نہیں تھا۔ اچھے شعر اچھی تحریر۔ اچھی بات کہیں سے بھی آئے تو بہت تعریف کرتے تھے۔ اُن کے مطالعہ میں عام کتب سے لے کر بے حد بوجھل اور ثقیل کتابیں رہتی تھیں۔ اگر انھیں کوئی غیر معروف یا عام مصنف بھی پسند آ جاتا تو بغیر کسی کمپلیکس کے اُس کے لیے اپنی پسندیدگی کا اظہار کرتے۔ بہت شروع میں مجھے یاد ہے کہ انھوں نے ہی مجھے ''ابنِ صفی'' کی کتابیں پڑھنے کا مشورہ دیا تھا۔ یاد رہے کہ جاسوسی ناول کو شاید اب تک ادب میں شمار ہی نہیں کیا جاتا اور بہت بڑے بڑے لوگ جو چھپ کر ''ابنِ صفی'' کو پڑھتے تھے وہ کبھی برملا اظہار نہیں کرتے تھے۔ انھیں لگتا تھا ''ابنِ صفی'' کے لیے اپنی پسندیدگی کا اظہار اپنے حلقہ میں اُن کی عزت میں کمی کا باعث ہوگا۔ ڈاکٹر صاحب سب میں بیٹھ کر برملا ان کتابوں کی تعریف کیا کرتے تھے۔ شفیق الرحمان صاحب بھی اُن کے پسندیدہ مصنف تھے بلکہ ان کی باتوں میں شفیق الرحمٰن کی چلبلی باتیں اور معصوم لطیفے جھلکتے رہتے تھے۔

ڈاکٹر صاحب کھلے ڈُلے مزاج کے ایک دلیر آدمی تھے جب انھوں نے بائی پاس کا آپریشن پاکستان ہی سے کروانے کا فیصلہ کیا تو تب یہ آپریشن یہاں پہ بہت کامیاب تناسب نہیں رکھتا تھا اور بہت بڑا رِسک سمجھا جاتا تھا۔ جب پنڈی میں آپریشن کے لیے گئے تو ان کے ساتھ جانے والے ہجوم میں مَیں بھی موجود تھا مجھے یاد ہے فائنل ٹچ دینے کے بعد جب ڈاکٹر صاحب کو وہیل چیئر پر آپریشن تھیٹر لے جا رہے تھے تو وہ سب لوگوں کو دیکھ کر یوں ہاتھ ہلا رہے تھے اور مسکرا رہے تھے جیسے وہ آپریشن تھیٹر نہیں بلکہ رفیع پیر تھیٹر جا رہے ہوں۔ سب کے منع کرنے کے باوجود انھوں نے پاکستان میں ہی آپریشن کرانے کا فیصلہ کیا۔ کیونکہ

انھیں اپنے اللہ پر بھروسہ تھا۔ اُس اللہ پر جس کے ساتھ اکثر اُن کا لڑائی جھگڑا ہی رہتا تھا۔ اللہ تعالیٰ نے انھیں نہ صرف صحت عطا کی بلکہ انھیں اتنی زیادہ ہمت دی کہ اُن کا بعد از آپریشن کا زمانہ اُن کے قبل از آپریشن کے زمانے سے بدرجہا بہتر رہا اور انھوں نے ترقی کی بہت سی منازل طے کیں۔

ڈاکٹر صاحب نے اپنی زندگی میں ایک اوسط آدمی کی زندگی میں آنے والے رنج والم، تکالیف کی نسبت بہت زیادہ غموں اور تکلیفوں کا سامنا کیا۔ اُن کے سامنے اُن کے بہت سے عزیز ترین رِشتے بچھڑتے چلے گئے اور آخر میں تنہا تھے مگر تنہا لگتے نہیں تھے۔ وہ کیسے مسلمان تھے مجھے نہیں پتہ لیکن اگر اللہ تعالیٰ اپنے نیک اور پسندیدہ بندوں کی زیادہ آزمائش کرتا ہے اُن پہ زیادہ بوجھ ڈالتا ہے تو پھر وہ ہم سب سے بہتر انسان تھے جنھوں نے اللہ کی طرف سے آئی ہوئی تکالیف اور دُکھ درد کو اس طرح صبر اور شکر سے برداشت کیا جس طرح برداشت کرنے کا حکم ہے۔ اللہ تعالیٰ انھیں جنت الفردوس میں جگہ دے۔

ڈاکٹر صاحب سے میری چاہت زندگی بھر بڑھتی ہی رہی اور سینکڑوں دوسروں کی طرح ہم بھی اسی یقین میں مبتلا رہے کہ ڈاکٹر صاحب ہمارے ساتھ خصوصی شفقت اور محبت رکھتے ہیں۔

حرفِ آخر یہ ہے کہ اگر خوش اخلاقی، خوش لباسی اور خوش گفتاری کو ایک جگہ اکٹھا کر دیا جائے اور اس میں ناقابلِ یقین پُرکشش مسکراہٹ چپکا دی جائے تو حاصل ضرب صرف اور صرف ڈاکٹر مقبول اختر ہی ہوگا۔ اب یہ میرے رب کا اٹل قانون ہے کہ ہر شخص نے رُخصت ہونا ہے۔ اس سے کسی کو مفر نہیں لہٰذا صبر اور شکر کے سوا کوئی چارہ نہیں۔ اللہ تعالیٰ انھیں جنت الفردوس میں جگہ دے۔

موت سے کس کو رُستگاری ہے
آج وہ کل ہماری باری ہے

ooo

A Man of Multiple Qualities

–Dr. Asif Tauseef–

My association with Dr. Maqbool Akhter esq began in 1997 when I was introduced to him by my writing teacher and boss Dr. Ehsan ul Haq. In those days I had a dacoity in my house and slowly I slipped in post traumatic distress.

From August 1997 on wards I used to meet him regularly to get rid of the post traumatic distress. During all this period, I found him to be a competent, dedicated and sincere doctor to his patients. I cant forget his ever smiling face and the confidence he had to handle difficult situations.

He was a man of Multiple Qualities. A good orator having a command on both Urdu, English and Punjabi.

He was a well read person in English, Urdu and Punjabi literature.

We started a project Psychoanalysis together. He being the therapist and I being the person who wanted to

remove all the speed breakers which were not allowing me to lead a happy life. During all this period I read Sig. Frend. All this helped me to a changed person and I learnt the act of psychoanalysis and dream analysis which is the royal road to the unconscious.

Unfortunately he left us foreve. But he will remain in my heart for ever. His guidance will help me always.

I always pray for him to be enjoying in the heavens. 'Ameen'.

OOO

ابّو جی

—ڈاکٹر زرقا عامر عزیز (بڑی بیٹی)—

چھوٹی پھپھو کا فون آیا کہ میں ڈاکٹر بھائی کے لیے ایک مختصر سی کتاب لکھ رہی ہوں، تم بھی اپنا مضمون لکھ کر بھیجو کہ اس میں شامل کیا جا سکے تو میں نے جواب دیا کہ نہیں لکھ پاؤں گی۔

''کیوں؟''

''مجھ سے لکھا نہیں جائے گا''

''مجھ سے کون سا لکھا جا رہا ہے؟ لیکن لکھنا تو ہے نا! مضمون لکھو اور جلدی بھیجو، بہت تھوڑا وقت باقی ہے ان کی برسی میں۔ تمہارا مضمون شامل ہونا لازم ہے۔۔۔ پیاری بیٹی کا۔۔۔''

میں نے بہت کوشش کی لیکن لکھ نہ پائی۔ پھپھو سے معذرت کے لیے فون کیا۔ انھوں نے پھر اصرار کیا اور نہ لکھنے کی وجہ پوچھی۔ میں نے کہا:

''دو تین لائنیں لکھتی ہوں تو سیاہی پھیل جاتی ہے۔''

''بہت آسان حل ہے۔ میرے ساتھ بھی یہی ہوتا تھا۔ اس لیے Lead پنسل سے لکھنا شروع کر دیا۔''

(پھپھو بھی آخر کو، ابو کی بہن ہیں۔ ان کے پاس بھی مسائل کے حل کے لیے کافی ''نسخے'' ہوتے ہیں۔'')

سو لکھ رہی ہوں۔۔۔ اس سے بھی آسان حل تلاش کر کے۔۔۔ کہ

ع خونِ دل میں ڈبولی ہیں اُنگلیاں میں نے

اور یوں بھی جس سنہری قلم کا ذکر مجھے کرنا ہے میں اسی کی ایک تحریر ہوں۔

Oliver Wendell Holmes کہتا ہے:

> "Memory is a net; one finds it full of fish when he takes it from the brook; but a dozen miles of water have run through it without sticking."

کیا کہوں۔ کہاں سے شروع کروں۔ اتنا تو میری یاد کا جال بھی وسیع نہیں کہ ان مہربان پانیوں کو ماپ سکے۔ میلوں تک پھیلا ہوا نظر کی حد سے بھی پرے۔

جہاں بھی جال ڈالوں مچھلیوں کے ڈھیر لگ جاتے ہیں۔ چھوٹی چھوٹی کئی یادیں آگے پیچھے دوڑتی ہوئی آتی ہیں اور آ کر میرا ہاتھ پکڑ لیتی ہیں۔

رات کا وقت ہے بجلی بند ہے۔ گرمی سے سب بے حال، میں ابو کے کندھوں پر بیٹھی ہوں اور وہ نہر کے کنارے چل چل کر مجھے مینڈکوں اور ٹڈوں کی آوازیں سنا رہے ہیں اور اسے قافیے میں ڈھال کر نظم کی صورت مجھے بہلا رہے ہیں:

ٹڈے ٹڈے بولدے

ڈڈو ڈڈو بولدے

یا یہ کہ کہانی سنتے سنتے کیا گیا سوال کہ ابو یہ سانپ چھتری کیا ہوتی ہے؟ اگلے

اتوار ابو بغل میں چٹائی دبائے ہاتھ میں کھانے کی ٹوکری پکڑے مجھے کندھوں پر بٹھائے پیدل چل کر رانا صاحب کے باغ سے سانپ چھتریاں اور کھمبیاں اکٹھی کرنے جا رہے ہیں۔

یا پھر یہ کہ آنکھ کھلتی ہے تو کسی مہربان ہاتھ کا لمس ماتھے پر محسوس ہوتا ہے۔ 'کوکڑ موکڑ' اُٹھو Ovaltine پیو پھر کالج جانا ہے۔ ابو کیا آپ نے Ovaltine بنائی؟ ہاں جب اماں شہر میں نہیں اور میں Baby Sitting کر رہا ہوں تو ذرا Proper طریقے سے ہو۔

یا یہ کہ سکول میں Inertia کی ایک Problem سمجھ نہیں آ رہی۔ گھر آ کر ابو سے پوچھتی ہوں اور کچھ دیر بعد ہم دونوں Coronation Library کے فرش پر آلتی پالتی مارے بیٹھے ہیں اور Physics سیکشن کی تمام کتب سامنے ڈھیر ہیں۔

زندگی کے ہر موڑ اور ہر پہلو پر ابو سے وابستہ کوئی یاد پڑی ہے۔ اِتنے شفیق، اِتنے محبت والے۔ ان سے بہتر کوئی دوست آج تک نہ مِلا۔ ان کی محبت کو ناپنے کا پیمانہ تو میرے پاس نہیں کہ صاحبِ اولاد ہو کر بھی میں ایک ماں بنی تو باپ کے جذبات کیا جانوں؟ مگر اِتنا یقین ہے کہ اگر باپ ہوتی تو اِتنا اچھا باپ نہ بن پاتی۔ ان کی محبت کی چادر اتنی گرم اور وسیع تھی کہ ہر درد، ہر دُکھ، ہر تکلیف اس میں چھپ جاتی۔

ابو سکول سے لینے آتے تو صبح سے لے کر اس وقت تک کی تمام کہانی راستے میں ہی سنا دیتی۔ وہ کہانی سکول سے چلتے چلتے کالج۔ پھر Practical Life، پھر بچے اور پھر بچوں کے سکول سے گھر آنے تک پھیلتی چلی گئی۔ میری اور ابو کی دوستی کا دائرہ وسیع ہوتے ہوتے میرے بچوں تک پہنچ گیا۔ اپنے بچے سے اس کے دِل کا راز، اس کی خوشی، اس کی خواہش، اس کے خوف جاننے کا گُر میں نے ابو سے سیکھا۔

بہت پیچیدہ تر گرہیں اتنے اطمینان اور اِتنی باریکی سے کھولتے کہ حیرت ہوتی کہ

کبھی اس رسّی میں بل بھی آیا ہوگا۔

ابو علم کا خزینہ تھے۔ ادب، شاعری، سیاست، معاشیات، فلسفہ، موسیقی، ہر موضوع پر وسیع علم رکھتے ہوئے بھی خود کو طفلِ مکتب سمجھتے اور زیادہ سے زیادہ وقت مطالعے میں صرف کرنے کی کوشش کرتے۔

مجھے ہمیشہ پیار بھری سرزنش کرتے کہ کبھی اپنی ان موٹی موٹی کتابوں کی گرد تو جھاڑ لیا کرو۔ تو میں کہتی:

when you are around I don't need to pick up a reference book.

اور یہ سچ بھی تھا۔ انگریزی پڑھتے پڑھتے کوئی نا قابلِ فہم French Phrase آ جاتی تو ڈکشنری اُٹھانے کی بجائے ابو سے سوال کیا جاتا۔ کوئی فارسی شعر اٹک جاتا تو ابو سے بہتر اس کا مفہوم کوئی کتاب بیان نہ کر سکتی۔ بچپن میں گورمکھی رسم الخط سکھایا۔ میجر اسحاق ان دِنوں سینٹرل جیل میں تھے، ابو ملنے جانے لگے تو میں نے ان کے نام خط دیا۔ واپسی پر تمتماتے چہرے اور اپنی اسی مخصوص مسکراہٹ کے ساتھ مجھے گلے لگا لیا اور کہنے لگے کہ میجر صاحب سب کو وہ خط دِکھا رہے تھے کہ مقبول کی چھوٹی سی بیٹی نے گورمکھی میں لکھ کر بھیجا ہے۔

۱۸ رجنوری کو ہونے والا حادثہ وہ سارا خزانہ بہا لے گیا۔ وہ شخص زبان دانی میں جس کا ثانی نہ تھا چھوٹی چھوٹی چیزوں کا نام یاد رکھنے کی جستجو کرنے لگا، جو زندگی کے ہر پہلو کو انتہائی تفصیل سے سمجھاتے تھے وہ اپنی ذاتی ضروریات بھی ڈھنگ سے بیان نہ کر پاتے۔

وہ ساری عمر سب کے لیے روشنی دِکھاتے اور راستے بناتے رہے اور اپنا راستہ کھو بیٹھے۔ اس احساس نے انھیں بے بس کر دیا۔ اس بے بسی کو زیادہ سہہ نہیں پائے۔

ے طلسمِ بود و عدم جس کا نام ہے آدم
خدا کا راز ہے قادر نہیں ہے جس پہ سخن

ابّو کی بیماری کے دِنوں میں ان کا کلینک بند کرنا پڑا۔ کچھ سامان سمیٹا۔ میز کی دراز سے کچھ کاغذ نکلے۔ ایک خالی دستہ بھی تھا جس کے شروع کے دو صفحوں پر کچھ لکھا تھا۔ پہلے صفحے پر تھا:

سفرِ حجاز

زہرہ کے نام جس کا 'سفرِ حجاز' سفرِ آخرت ثابت ہوا۔

نیچے تھا:

ع متاعِ قافلہ من حجازیاں بردند

ہم نے مِل کر بہت سے بھلے دِن گزارے

برے دِن میرے حصے میں آئے ہیں

اگلے صفحے پر تھا:

All I need is you

Ah no!

The years, the years

The years, O!

میں نے لکھ کر پوچھا ابّو امّی کے لیے کوئی کتاب لکھنے لگے تھے۔ کوئی جواب نہ دیا۔ گیلی آنکھوں کے ساتھ سامنے دیوار کو تکتے رہے جہاں امی ابو کی شادی کے شروع دِنوں کی تصویر لگی ہوئی ہے جس میں ایک پیار کرنے والا جوڑا کھلکھلاتے چہروں اور پوری چنچلتا کے ساتھ ایک دوسرے کو دیکھ رہا ہے۔

کچھ دیر بعد بورڈ پر لکھا "لکھ ہی نہیں پایا۔"

میاں کی ٹرانسفر۔ امی کی وفات۔ بینک سے معاہدہ۔ کچھ ایسا سلسلہ چلا کہ ایک سال میں چار رہائش گاہیں بدلیں۔ ابو سے ذِکر کیا کہ اِن دِنوں بہت Under Stress ہوں۔ کہنے لگے ہاں اپنا گھر شفٹ کرنا بھی Stress Levels میں اُونچے درجے پر آتا

ہے، پر پتا ہے اس سیڑھی کا سب سے اُونچا درجہ کونسا ہے۔ Losing a Spouse۔ اور یہ میں ہی جانتا ہوں۔

برسوں کی لمبائی گنتے گنتے بالآخر امی کے پاس چلے ہی گئے۔

ے کیوں کوں ڈاچی ساگر خاطر

مارُو تھل چھڈ جائے وے

ابو زندگی کے ساتھ سے بچھڑنے کا غم بڑا۔ لیکن ماں باپ کو کھونے کا بھی کم نہیں۔

کہتے ہیں کل ملیں گے۔ لیکن کب ملیں گے؟

تب تک کیا؟

یہ دُکھ کب ختم ہوگا؟ بہلاوا، وقت کے ساتھ ختم ہو جائے گا۔ حقیقت، زندگی کی رگ رگ میں پھیل جائے گا۔

بہلاوا، اس دُکھ کو بھولنا سیکھو۔ حقیقت، اس دُکھ کے ساتھ جینا سیکھو۔ آج یہی کر رہی ہوں۔

OOO

زندہ باد مقبول اختر زندہ باد

—ڈاکٹر سلطان عبداللہ—

کسی بھی ایسے انسان کے بارے میں لکھنا کتنا مشکل ہے جسے آپ جانتے بھی ہوں اور بیک وقت نہ بھی جانتے ہوں۔ جو سر سے پاؤں تک سراپا خود اعتمادی ہو۔ حقیقی خوشی اور طمانیت کا مظہر ہو۔ دنیا میں رہتے ہوئے دنیا اور دنیاوی تقاضوں سے بے نیاز زندگی کی منزلیں طے کر رہا ہو۔ ہمیشہ مسکراتا ہوا نظر آئے اور ملنے والوں کو نئی صبح کے سندیسے دے۔ اپنی تکلیف کو اس طرح چھپالے کہ دوسروں کو تو کیا اپنے آپ کو بھی خبر نہ ہو۔

کئی سال پہلے ڈاکٹر احسان الحق کے ساتھ ایک بلند قامت، خوبصورت شخص کو ہر محفل میں پایا، جو گفتگو میں کم، کم شامل ہوتا مگر بات ہمیشہ مثبت کرتا۔ کبھی بھی اس کا چہرہ لٹکا ہوا نہیں دیکھا گیا۔ مسکراہٹ جیسے اس کی شخصیت کا ایک حصہ تھی۔ چناب کلب میں وہ ڈاکٹر احسان کے علاوہ ایک اور شخص کے ساتھ نظر آتا۔ یہ تینوں ایک کونے میں بیٹھے کھانا کھاتے اور باقی تمام لوگوں سے بے خبر، محو گفتگو ہوتے۔ جب کبھی مجھ پر نظر پڑ جاتی تو ہمیشہ اٹھ کر میرے پاس آتے۔ خیریت دریافت کرنے کے بعد، اس کام کی حوصلہ افزائی کرتے جو میں کر رہا تھا۔ پروفیشن کے لیے یا پھر پروفیشنل ساتھیوں کے لیے۔

کافی دیر بعد جب معلوم ہوا کہ یہ تو میرے بہت بڑے محسن ڈاکٹر فتح محمد چوہدری کے بھانجے اور ایک سینئر نشتیرین ہیں تو احترام اور محبت میں بے پناہ اضافہ ہو گیا۔ اب میں انہیں سلام کرنے میں پہل کرتا اور دعائیں لیتا۔

ہاں! یہ تھے ہمارے اور سب کے مقبول اختر، جو ایک دن اپنی بیماریوں سے خاموشی سے اکیلے ہی لڑتے لڑتے، مسکراتے ہوئے چہرے کے ساتھ، ہم سے رخصت ہو گئے۔ مگر جاتے جاتے، ہمیں زندگی کا پیغام دے گئے کہ موت تو زندگی کا ارتقا ہے۔ اس کیفیت میں داخل ہونے پر ملال کیسا؟ خوشی خوشی اس ارتقائی منزل میں داخل ہو جاؤ۔

اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ وہ انہیں قیامت والے دن، اپنے دیدار سے نوازے اور تب تک انہیں اپنے نہایت ہی قریب، جوارِ رحمت میں جگہ دے۔ آمین!

OOO

کچھ یادیں، کچھ باتیں

—ڈاکٹر سلطان اکبر قریشی—

ڈاکٹر مقبول اختر کا کلینک، میرے کلینک کے قریب ہی واقع تھا۔ صبح میں ہم دونوں سوشل سیکورٹی ہسپتال میں بطور سپیشلسٹ ڈاکٹر کام کرتے تھے۔ اکثر میں ڈاکٹر مقبول اختر کے کلینک چلا جاتا اور مختلف موضوعات پر گپ شپ ہوتی۔ دھیمے مزاج کے پرخلوص انسان تھے۔ ہر موضوع ان کے دائرۂ کار میں تھا۔

ایک روز میں نے ان سے پوچھا کہ خوشگوار ازدواجی زندگی کے لیے کوئی فارمولا ہے؟ کہنے لگے:

''بہت آسان فارمولا ہے۔ گھر میں جتنے صحیح کام ہوں وہ بیگم کے کھاتے میں اور ہر کام جو غلط ہو جائے اس کا ذمہ دار شوہر۔۔۔ عمل کر کے دیکھو! بخدا گھر میں سکون ہی سکون ہوگا۔۔۔''

پھر گویا ہوئے۔

''میں اپنی ایک مثال دیتا ہوں۔ میں اپنے گھر پر لان میں بیٹھا تھا۔ یاد رہے کہ

کئی کنال پر مشتمل مکان کا لان بھی کافی بڑا اور کچن سے کافی دور تھا۔ اچانک کسی برتن کے ٹوٹنے کی زوردار آواز آئی۔ کوئی بڑا برتن غالباً ڈونگا وغیرہ ٹوٹا تھا، جو آواز اتنی دور تک آئی۔ میں نے لان میں بیٹھے بیٹھے آواز لگائی۔

''ہاں، ہاں یہ برتن مجھ ہی سے ٹوٹا ہے۔''

OOO

Dr. Maqbool's Nishter Medical College

–Dr. Fayaz Mehmood–

Those were the days when we were young, and everything looked rosy, fascinating. New and beautiful structure of Nishter Medical College with modern design and facilities, grand dissection hall and pharmacology museum are few examples of this college, excellent hospitals, hostels, play grounds, lawns and of course rose garden heart throb of young ones simply still the best structure of a Medical College in Pakistan.

We had a galaxy of brilliant teachers like Dr. Toosi. Dr Nazir Sb, Dr Ibrahim Sb, Dr Rauf Sb, Dr Shafi Sb, Dr Akhter Sb, Dr Sial Sb, to name a few and of course Dr Jamil Bhutta Sb, master mind of this great college.

Medical conferences, musical concerts All Pakistan debates and Sports festivals were regularly held and we had the honour of listening to Hafeez Jullandri, Josh, Saghir Siddique, Jigger Muradabadi, Adam, Jaffery and others and also enjoyed the music of Roshan Ara

Begum, Nazakat Salamat and Ghulam Ali Khan.

Nishter College produced highly qualified doctors in different fields of Medical Surgery who gained international recognition after specialization, such as Dr Khalid Javed Awan ophthalmologist and Dr Rashid Latif (Gynaecologist) to name a few.

Dr. Maqbool was my hostel fellow for five years. This group of friends were Butt brothers. Rashid Latif, Ch Rafique, Wajid and Shabbir Haider.

From those days I remember that I became best athlete of the college and Dr Maqbool and his friends congratulated me and asked for a heavy (high) tea, which was duly served although they were not in my close circle of friends. This shows their faith in themselves and the respect they enjoyed

This group of friends made a list of students from this hostel who will qualify final professional MBBS exam in first attempt and they included my name in the list, where as I had gone to Karachi to participate in All Pakistan Inter university Athletic championships and did not appear in part of sent up exam. I think it was their prayers and well wishes which bore fruit and I was never a studious person.

Literary people say that "Never quote a living author". I will mention a few examples which you may better interpret.

To portray a personality I think it is better that

events should throw light rather than words. With my limitation of knowledge I will present some instances.

It is very difficult to surrender and admit ones frustrations. It requires a very big heart which Dr Maqbool had.

Once at Dr Ehsan's residence Prof Irshad sb read Faiz's poem on Hazrat Hussain (AS) and said that you can see blood in this poetry. I said you are correct but Faiz sb has not written a word about 50 lac Afghan Muhajirs in Pakistan, who have lost their sons, fathers, daughter and sisters.

Dr Maqbool did not say a word and this is called Sagacity, bravery and courage.

During one trip to Lahore I asked Dr Maqbool as to why communism almost lacked behind in fertile in poor land of India. Dr Ehsan said that no land is suitable for this ideology and Dr Maqbool kept mum. This shows character.

At his clinic last year he recited Adam. (عدم)

ضمیر صدف میں نور کے جلوے
ہیں کیسے کیسے ٹھکانے ترے
اک داغ سجدہ میری کائنات
جبیں تری آستانے ترے

He said that people here failed to understand. عدم
Of late whenever we met I used to ask how is

everything and would always say. اللہ کا بڑا کرم ہے

Music, love, fragrance and knowledge was all around when Dr Maqbool, Dr Ehsan and Professor Irshad and Professor Bukhari, conversed in musical sittings and Persian music was their choice. Dr Maqbool favourite songs are as follow.

۱۔ زندگی اک آرزوے مبہم
یک طلوع و غروب یک دم
۲۔ زندگی یک کور راہ است
بہ اُمیدِ یک نگاہِ
۳۔ مثل یک چراغ روشن
سو ے یک شب سیاہ
مگہ نہ مگہ نہ (کیا نہیں ہے)

ترجمہ: زندگی اک آرزو مبہم ہے اک دم کا طلوع وغروب ہے۔
زندگی اک اندھی راہ ہے اُمید کی نگاہ کی منتظر
مثل ایک چراغِ روشن سوے (طرف) ایک سیاہ شب کے

قصہ نام، ننگ، قصہ عزیز و اوج قصہ ساحل و موج وصل یا جدائی
قصہ یاس و اُمید، سیاہ یا سفید، سربسر رسوائی
وقتیکہ رو لب بستہ غنچہ پائیزی آید چہ غم انگیزی آید
چہ بیگوید، بہ کی بیگوید ، زندگی عاقبت تشنہ رہنا ہے

ترجمہ: جب غنچہ کے بند لبوں پر خزاں آتی ہے تو کیا غم انگیز ہوتی ہے۔ کیا کہے اور کس سے کہے۔

ؔ زندگی کی عاقبت تشنہ رہنا ہے
اک نغمہ ناتمام ہے جو گایا جاتا ہے
بگذر از عشق افسانے مگو۔ افسانے با دیوانے مگو
منم آں مستیِ میخانہ غم۔ با من طرز پیمانے مگو

ترجمہ:

عشق کی بات چھوڑو افسانے نہ کہو
افسانے دیوانے سے نہ کہو
میں غم کے میخانے کی مستی ہوں
مجھ سے طرز پیمانے نہ کہو

Dr Sb used to give new meanings to these songs and enlightened all of us. On insistence of Dr Maqbool, Prof Bukhari Sb gave credit to me for Nusrat Fateh Ali Khan success in west in his book "Lyallpur Kahani". I told Dr Sb that my humble contribution was that I used to present Nusrat, pieces of Persian, Turkish and Western Music.

Dr Maqbool asserted that "It was enough material to lead Nusrat towards international music."

To describe Dr Maqbools personality, his manners, behaviour, knowledge, professional skill, struggle for downtrodden, philosophical knowledge and literary capability, requires a literary pen but do not forgot his Smile.

May his soul rest in peace.

OOO

ڈاکٹر مقبول اختر — میرا پیارا دوست

-ڈاکٹر مختار احمد-

آج منزہ بہن نے ڈاکٹر مقبول اختر کے لیے میرے تاثرات لکھنے کو کہا۔ ڈاکٹر مقبول اختر کے ساتھ گذارا ہوا وقت ایک ایسا احساس ہے جو الفاظ میں بیان نہیں ہو سکتا۔ ڈاکٹر مقبول اختر جیسی شخصیت خوش قسمت دوستوں کو نصیب ہوتی ہے۔ میں نے آج تک اس کے چہرے پر ناگواری کے آثار نہیں دیکھے۔ جب بھی اس سے ملاقات ہوتی تھی وہ ہنستا مسکراتا نظر آتا۔

میرا تعلق، ڈاکٹر مقبول سے ۱۹۵۷ء سے ہے۔ جب ہم نے نشتر میڈیکل کالج میں داخلہ لیا۔ ہم مسلسل پانچ سال، ایک ہی ہاسٹل میں اکٹھے رہے۔ ہوسٹل میں روزانہ۔۔۔ صبح، شام، رات ان کا مسکراتا چہرہ نظر آتا۔ مجھے پچھلے ۵۳ سال میں، کوئی ایسا وقت یاد نہیں جب میں نے مقبول کے چہرے پر معصوم سی مسکراہٹ نہ دیکھی ہو۔ انتہائی مشکل حالات میں بھی، اس کی مسکراہٹ کبھی ناگواری میں تبدیل نہیں ہوئی۔ By pass آپریشن کے بعد وہ اکثر اپنے Lab test کروانے کے لیے میرے پاس آتے رہتے تھے اور Brain Surgery کے بعد بھی، خود سیڑھیاں چڑھ کر، اسی مسکراہٹ کے ساتھ، لیب میں آتے تھے۔ ڈاکٹر مقبول اختر کی خوش اخلاقی اور اعلیٰ ظرفی کی سبھی دوست بہت قدر کرتے ہیں۔

اللہ تعالیٰ ان کی مغفرت فرمائے۔ آمین!

دائمی مسکراہٹ

-ڈاکٹر وحید احمد-

۷۰ء کی دہائی کا لائل پور، لکھاریوں کی کہکشاں سے جگمگا رہا تھا۔ شاعروں، نثر نگاروں اور دانشوروں کی ٹولیاں مختلف ہوٹلوں اور قہوہ خانوں میں سارا دن اور آدھی رات تک پائی جاتیں۔ ہوٹل الجاوید، خیام، کیری ہوم، محفل اور جھنڈے کا ہوٹل، دانشوروں کے مخصوص ٹھکانے تھے۔ متمول (پیٹی بورژوا) دانشور اور عالم، کافی ہاؤس میں بیٹھک لگاتے۔ لکھنے والوں کے اس ہجوم میں ایک چہرہ سب سے جدا نظر آتا۔ ہونٹوں پر دائمی مسکراہٹ لیے جو کنجِ لب سے گوشۂ چشم تک جاتی اور عینک کے شیشوں میں جھلملاتی تھی۔ یہ ڈاکٹر مقبول اختر تھے۔ ترقی پسند اور روشن خیال دانشور، جو گفتگو سے محفلوں کو کشتِ زعفران بناتے اور اپنے مضامین سے ذہنوں کی تربیت کرتے۔ ادبی حلقے ہوں یا نئی کتابوں کی تقاریب، ڈاکٹر مقبول اختر کے بغیر ادھوری رہتیں۔

فیصل آباد کی ادب و دانش کی تاریخ ڈاکٹر صاحب کے بغیر ادھوری ہے۔ انہوں نے اپنی زندگی کا بیشتر حصہ دانش کی تعلیم دینے میں گزارا ہے۔ فیصل آباد کو ہمیشہ ان پر ناز رہے گا۔ ان کے لفظوں کے پروئے ہوئے موتی سدا آبدار رہیں گے۔ ان کی مسکراہٹ، ذہنوں پر کندہ ہے اور رہے گی۔

یادوں کا در کھلتا ہے

(ایک انسان دوست، ترقی پسند، دانشور، ماہرِ امراضِ نفسیات)

-ڈاکٹر یونس ایاز-

ڈائریکٹر سوشل سیکورٹی

مت سہل ہمیں جانو، پھرتا ہے فلک برسوں
تب خاک کے پردے سے انسان نکلتے ہیں

وقت کا پہیہ ہزاروں سال سے محوِ گردش ہے۔ قافلۂ آدم یونہی رواں دواں ہے۔ لوگ ملتے اور بچھڑتے رہتے ہیں، مگر کچھ لوگ ایسے بھی ہوتے ہیں جو انہیں گونا گوں خوبیوں کی بنا پر دوسروں سے ممتاز کرتے ہیں۔ انہیں جانِ محفل کہیں، میر کارواں کہیں کہ چراغِ انجمن کہیں، وہ چمن میں ہمیشہ گلاب کی طرح کھلتے ہیں۔ اپنی خوشبوئیں لٹاتے لٹاتے اگر مرجھا بھی جائیں تو یہی گلاب زینتِ اوراق بنتے ہیں۔

دانشور ڈاکٹر مقبول اختر، ترقی پسند برادری اور سوشل سیکورٹی ہسپتال کی مقبول ترین شخصیت تھا۔ سیاسی ماحول اور اپنے اردگرد پر گہری نظر رکھنے کی وجہ سے ہمیشہ متحرک رہتے کہ سماج کی جھوٹی روایات کے 'باغی' تھے۔ ڈاکٹر مقبول اختر نے اپنے نظریات اور دوستی کے عظیم

رشتے کو ضرورتوں اور تمناؤں کے بندھن سے آزاد رکھا۔ انہوں نے دوستی کو ہمیشہ مقصدیت
کے آئینے میں دیکھا اور ہر اس شخص کو دوستی کی دعوت دے ڈالی جس کی نظریں مساوی نتائج
سے آگے دیکھنے کی تمنا رکھتی تھیں۔ وہ پڑھے لکھے متمول گھرانے کے فرد تھے، لیکن ان سے
دوسروں کی فاقہ مستی دیکھی نہ جاتی۔ وہ اقبال کے اس شعر کی جیتی جاگتی تفسیر تھے۔

ہو حلقۂ یاراں تو بریشم کی طرح نرم
رزمِ حق و باطل ہو تو فولاد ہے مومن

منزہ بہن کا حکم ہے کہ لکھنا ہے، سو۔۔۔ لکھ رہا ہوں۔۔۔ مگر بہت مضطرب اور
غمگین ہوں۔ رات کے گہرے سناٹے میں یادوں کو لفظوں کا روپ دینے چلا ہوں۔ یادوں
کا یہ موسم سدا بہار ہے۔ ہمیشہ جوان رہتا ہے اور یادوں کے اس آتش کدے میں اپنا ہی
وجود جھلستا رہتا ہے۔ کس کس یاد کو 'یاد' کروں۔ ہر یاد پر روح کے سناٹے چیخ اٹھتے ہیں۔۔۔
آہ! ڈاکٹر مقبول اختر کو مرحوم کیسے لکھوں؟

جوئے خوں آنکھوں سے بہنے دو کہ ہے شامِ فراق
میں یہ سمجھوں گا کہ شمعیں دو فروزاں ہو گئیں

ڈاکٹر مقبول اختر صاحب سے میرا پہلا تعارف ہمارے ایم۔ ایس ڈاکٹر سید تجمل
حسین صاحب کے توسّط سے ہوا۔ ہم ڈاکٹر مقبول اختر کے کلینک پر گئے۔ اعلیٰ درجے کے
سوٹ میں ملبوس ایک کلین شیوڈ شخص، معصوم چہرہ، روشن اور سوچتی ہوئی آنکھیں۔

پھول چہرہ ہے، شفق لب ہیں، سحر ہیں آنکھیں
ایک انسان کی صورت ہے مثالوں جیسی

ان کی شخصیت سحر انگیز تھی۔ مقبول صاحب، مجھ سے غائبانہ متعارف تھے۔ ڈاکٹر
تجمل حسین سے کہنے لگے:
"آپ یونس کو میرے پاس چھوڑ جائیں۔"

پھر میجر اسحاق محمد، مزدور کسان پارٹی اور فیض احمد فیض کی ڈھیروں مشترکہ یادوں
کا دور چلا اور ہم دونوں نزدیک ہوتے گئے۔ پھر میں ہمیشہ کے لیے ڈاکٹر صاحب کے کلینک
کا ہو کر رہ گیا۔

پاکستان میں کمیونسٹ تحریک کی ناکامی اور ترقی پسندانہ سوچ کے زوال پر بحث
ہوتی اور ہر بحث کا اختتام وہ یہ کہہ کر کرتے کہ
"تم دیکھنا یہ مذہبی شدت پسند پاکستان کو خون میں نہلا دیں گے۔"

اکثر ہسپتال میں چائے کے وقفے کے دوران، ڈاکٹر سلیمان مرحوم کے 'پاک ٹی
ہاؤس' میں محفل جمتی۔ ڈاکٹر مقبول اختر کا اندازِ گفتگو دھیما اور مدلل تھا، مگر ہمیشہ چیلنج کرتے
ہوئے مقابلے کی دعوت دیتے تھے۔ جیسے وہ قدم قدم کہہ رہے ہوں

جو ہم نہ ہوں تو زمانے کی سانس رک جائے
قتیلِ وقت کے سینے میں ہم دھڑکتے ہیں

۱۹۹۵ء میں ڈاکٹر ایسوسی ایشن کا الیکشن تھا۔ میں ایسوسی ایشن کا جنرل سیکرٹری تھا۔
ڈاکٹر مقبول اختر، ڈاکٹرز سیاست سے تقریباً کنارہ کش تھے کہ ریٹائرمنٹ قریب تھی۔ میں
نے ایک رات، الیکشن کا تذکرہ کیا تو کہنے لگے:
"افہام تفہیم سے ایگزیکٹیو باڈی کا انتخاب کر لیں کہ ڈاکٹرز ایسوسی ایشن ہی،
ڈاکٹروں کے مسائل حل کرنے کا واحد پلیٹ فارم ہے اور باڈی میں اہل اور جرأت مند افراد
کا ہونا ضروری ہے۔ پھر مجھے ہدایت کی کہ ڈاکٹرز کے تمام گروپس سے مذاکرات کر کے،
باڈی تشکیل دینے کے لیے نام لے لیں۔ ابھی میں رابطے بحال ہی کر رہا تھا کہ ایک مخصوص
مکتبہ فکر کے حامل ڈاکٹرز نے یکایک الیکشن کے لیے اپنا پینل اناؤنس کر دیا اور ہم لوگوں پر
روایتی جارحانہ انداز میں فتویٰ بازی شروع کر دی۔ الیکشن ڈاکٹرز ایسوسی ایشن کا۔۔۔ مگر مہم
کا آغاز ہمیں بے دین اور منکر قرار دے کر کیا گیا۔ بدترین قسم کی کردار کشی شروع کر دی گئی۔

ڈاکٹرز جیسی پڑھی لکھی کمیونٹی سے ایسے اندازِ فکر و پروپیگنڈہ کی توقع نہ تھی۔ میں بہت متفکر رہا اور شدید غصہ کے عالم میں ڈاکٹر مقبول صاحب کے پاس گیا۔ انہوں نے ماہرِ نفسیات ہونے کا بھرپور مظاہرہ کیا اور میرا اشتعال جب قدرے کم ہوا اور میں مسکرانے لگا تو کہنے لگے:

''چلو، ایک بار پھر سے 'جوان' ہو جاتے ہیں۔ سمجھ لو کہ ہم زمانۂ طالب علمی میں واپس چلے گئے ہیں۔ مخالفین کی بھرپور الیکشن مہم سے یوں لگا ہے کہ جیسے سرخ و سبز، بائیں اور دائیں بازو کا دور، انگڑائی لے کر پھر سے جوان ہو گیا ہے۔''

تمام دوست اکٹھے ہوئے۔ پینل کی تشکیل ہوئی مخالف سبز گروپ نے ایک انتہائی سینئر سپیشلسٹ ڈاکٹر کو صدارت کے لیے نامزد کیا تھا۔ ہم نے ڈاکٹر مقبول اختر کو صدارتی امیدوار بنانے کا فیصلہ کیا۔ اب مرحلہ یہ تھا کہ ڈاکٹر مقبول صاحب کو راضی کون کرے گا۔ ڈاکٹر تجمل حسین شاہ اور مجھے یہ ذمہ داری سونپی گئی۔ ہم شام کو ڈاکٹر مقبول صاحب کے کلینک گئے، تمام صورتِ حال گوش گزار کی تو پینل دیکھ کر کہنے لگے۔

''میرے ساتھ جنرل سیکرٹری آپ ہو۔ جیتنے کے بعد ساری ذمہ داری آپ پر ہو گی۔ اب میں زیادہ بھاگ دوڑ نہیں کر سکتا۔''

ایسا اعتماد کہ ہم میں جوانی لوٹ آئی۔

ڈاکٹر مقبول صاحب صدر اور میں جنرل سیکرٹری، ڈاکٹر آصف لطیف رندھاوا نائب صدر اور بارہ رکنی ایگزیکٹو باڈی سمیت پینل اناؤنس کیا۔ ہم دونوں کے عہدوں پر گھمسان کا رن پڑنے والا تھا۔ بھرپور الیکشن مہم کا آغاز ہو گیا۔

ڈاکٹر مقبول اختر صاحب مجھ سے کہنے لگے:

''تمہیں کالج، یونیورسٹی کے الیکشن لڑنے اور جیتنے کا تجربہ بھی ہے اور ابھی تم جوان بھی ہو۔ اپنی ٹیم کو لے کر میدان میں کود جاؤ اور یہ یاد رکھنا کہ میں شکست خوردہ ریٹائرمنٹ لے کر گھر جانا پسند نہیں کروں گا۔''

پھر مجھ سے اکیلے میں بات کی۔

''میں کوشش تو پوری کروں گا مگر میں زیادہ متحرک نہیں رہا، مجھ سے بہت سی اُمیدیں وابستہ نہ کر لینا۔ تم معراج محمد خان کے سچے شاگرد ہو اور کراچی میں 'اس' گروہ کو ناکوں چنے چبوا چکے ہو۔ قید و بند بھی تمہیں جھکنے پر مجبور نہیں کر سکی تو اب یہ کردار کشی کی مہم کیا حیثیت رکھتی ہے۔ آج سے سرخ پرچم تمہارے ہاتھ میں ہے۔ انٹرنیشنل کا نعرہ لگاؤ۔ یار، کوئی الیکشن تو ہم بھی جیتیں۔''

ڈاکٹرز ایسوسی ایشن کی تاریخ میں ایسا عہد ساز اور اعصاب شکن، الیکشن کبھی نہیں ہوا۔ دن رات الیکشن مہم بھرپور انداز میں جاری تھی۔ روزانہ رات کو ڈاکٹر مقبول اختر صاحب کے کلینک پر لائحہ عمل طے ہوتا اور دن بھر کی کارکردگی کا جائزہ لیا جاتا۔ مخالفین نے الیکشن کو کفر و اسلام کا معرکہ قرار دے دیا تھا۔ بڑے بڑے سپیشلسٹ ڈاکٹرز کو اکٹھا کر کے قرآن پاک پر حلف لیا گیا کہ 'بے دین' لوگوں کو ووٹ نہیں دینا۔ گویا ہمیں دائرہ اسلام سے ہی خارج کر دیا گیا۔

اِکا دُکا جھڑپیں بھی ہونے لگیں۔ خواتین ڈاکٹرز کی بھاری تعداد ہماری سپورٹر تھی۔ ان کے گھروں پر مخالفین کے وفد جانے لگے۔ وہی روایتی ہتھکنڈے جو کہ زمانۂ طالب علمی سے ان کا وطیرہ رہا ہے۔ ڈراؤ، دھمکاؤ اور کردار کشی کی ناجائز مہم۔ پنجاب بھر سے ناظمین جمع ہو کر، مخالف گروپ کے لیے مہم چلا رہے تھے اور ہمیں کہہ رہے تھے کہ نوشتۂ دیوار پڑھ لو اور مقابلے سے دست بردار ہو جاؤ۔ اس اعصاب شکن صورتِ حال میں ہم نے صبر کا دامن ہاتھ سے نہ چھوڑا۔ ہماری مہم اپنے منشور اور سابقہ کارکردگی پر مبنی تھی۔ جبکہ مخالف گروپ اپنے منشور کی بجائے، ہماری ذاتی مخالفت پر مہم چلا رہا تھا۔ ہمیں مختلف ذرائع سے پیغام دلوائے گئے کہ باعزت راستہ تلاش کیا جا سکتا ہے مگر ڈاکٹر مقبول اختر صاحب نے کہا کہ

''مقابلہ شروع ہو چکا ہے۔''

اور قلم سے کاغذ پر لکھا

'الیکشن آن (✓)'

ہمارا جوش وجنوں دیدنی تھا۔ ہم نے مارشل لا کے بدترین مظالم سہے تھے۔ سرخ سویرے اور تبدیلی کے خواب دیکھے تھے۔ لالہ حیدر اور فیض احمد فیض کے قدموں میں بیٹھ کر تحریکیں منظم کرنا سیکھا تھا۔ ہم الیکشن سے کیسے دست بردار ہو جاتے اور چند سیٹوں پر قناعت کر لیتے۔ ہمیں خصوصی طور پر یہ کہا جا رہا تھا کہ صدارت سے ڈاکٹر مقبول اختر کو دست بردار کرالیں تو بات ہو سکتی ہے مگر تبدیلی کے خواہاں روشن اذہان کو اپنے قائد کو سرخرو کرنا تھا۔

آخر پولنگ کا دن آ گیا۔ جب میں سابقہ جنرل سیکرٹری کی حیثیت سے تقریر کر کے ڈائیس سے واپس آیا تو مقبول اختر نے کہا۔

''تم نے تقریر کا حق ادا کر دیا ہے۔ آج فیض احمد فیض تم سے خوش ہوں گے اور جن ڈاکٹرز کے کان سنتے ہیں وہ دماغ سے کام لیں گے۔''

ووٹنگ شام چار بجے تک جاری رہی۔ جب ووٹوں کی گنتی ہو رہی تھی تو مخالف گروپ نے افواہ اڑا دی کہ 'انقلابی' الیکشن ہار گئے ہیں بلکہ صدارتی امیدوار سینئر سپیشلسٹ صاحب نے خطبۂ صدارت دینا بھی شروع کر دیا کہ ہم نے تو باعزت راستہ دینے کی کوشش کی مگر!!!

ڈاکٹر مقبول اختر صاحب، ڈاکٹرز کے گروپ کے ساتھ گھاس پر بیٹھے تھے۔ وہ یہ افواہ اور صدارتی امیدوار کی تقریر سن کر گھاس پر لیٹ گئے اور چند لمحے متفکر ہوئے۔ (یہ مجھے بعد میں دوستوں نے بتایا کہ میں اس دوران ووٹوں کی گنتی کروا رہا تھا)

ابھی ووٹوں کی گنتی جاری تھی۔ میں نے واضح برتری دیکھی کہ ہم فیصلہ کن فتح حاصل کر چکے ہیں اور ہمارا سارا پینل جیت گیا ہے۔ میں نے باہر آ کر 'انٹرنیشنل' کا نعرہ بلند کیا تو ڈاکٹر مقبول اختر صاحب عالم وارفتگی میں مجھ سے لپٹ گئے اور تمتماتے چہرے کے

ساتھ مبارکباد وصول کرنا شروع کی۔

معاملہ فہم اتنے تھے کہ مجھے فوراً کہا کہ جاؤ اور مخالف گروپ کے امیدواروں سے ملاقات کرو۔ تمام رنجشیں ختم اور یہ کہ آئندہ سال ہم الیکشن میں مخالف گروپ کو باڈی تشکیل دینے کی دعوت دیں گے بلا مقابلہ اور آئندہ الیکشن میں ہم نے کمال ظرف کا مظاہرہ کرتے ہوئے اپنے قائد ڈاکٹر مقبول اختر کا وعدہ پورا کیا۔ یہ اور بات کہ مخالف گروپ کو باڈی کی تشکیل کے لیے ڈاکٹرز پورے نہ مل سکے مگر ہم نے ادھوری ایگزیکٹو باڈی بھی قبول کر لی۔۔۔ دوستوں نے اعتراض کیا تو میں نے انہیں کہا کہ ہم اپنے پیر مغاں کی بات کیسے ٹال سکتے ہیں۔

آج فیصل آباد کو یہ اعزاز حاصل ہے کہ وہ پورے پنجاب ڈاکٹرز ایسوسی ایشن کی قیادت کر رہا ہے۔ (میں ڈاکٹرز ایسوسی ایشن پنجاب کا صدر ہوں) اور اپنے عظیم قائد ڈاکٹر مقبول اختر صاحب کی سوچ وفکر کو آگے بڑھانے میں دن رات کوشاں ہے۔

ڈاکٹر مقبول اختر جیسے لوگ، تاریخ اور عہد ساز ہوتے ہیں۔ انہی عظیم لوگوں کے دم سے جذبے جوان اور تحریکیں زندہ ہیں۔ یہی لوگ جذبوں کو مہمیز کرتے ہیں۔ ڈاکٹر مقبول اختر نے اپنے کالموں، تحریروں کے ذریعے، روشن خیالی، رواداری اور انسان دوستی کا سبق دیا۔ وہ اکثر افسوس کا اظہار کرتے تھے کہ ہم لوگوں سے دیہات میں کام نہیں ہو سکا اور جب تک دیہاتی منظم نہیں ہوں گے، تبدیلی نہیں آئے گی۔ ایک دن موڈ میں تھے، کہنے لگے:

''یونس، فکر نہ کرو، ہم نے اپنا کام مکمل ایمانداری سے کیا ہے۔ آنے والے دنوں میں خواب گم شدہ کی لو جاگ اٹھے گی۔ ظلم کو ابھی مزید بڑھنا ہے مگر سوال یہ ہے کہ ہماری قوم کے بزرجمہر کب تک غیر یقینی کیفیت کے درمیان سفر کرتے رہیں گے اور کن تباہیوں کی طرف اپنے جواں قافلوں کو دھکیلتے رہیں گے۔''

ڈاکٹر مقبول اختر دن کو مسیحائی اور رات کو دانشوری فرماتے۔ تحریر و تحریک کے

ذریعے غریب کی زندگی میں انقلاب لانے کے منصوبے۔۔۔ یہ وہ دور تھا جب اولیائی اور مسیحائی کے راستے الگ الگ نہیں ہوئے تھے۔ مسیحا ابھی، اولیاء کا رُوپ دھارے ہوئے تھے۔ (اب تو مسیحائی بھی کاروبار (کمرشل) ہو چکی ہے۔) ڈاکٹر مقبول اختر آخری سانس تک اولیائی کے درجہ پر فائز رہے۔

وہ انتہائی اعلیٰ درجے کے بذلہ سنج اور زندگی کو بھرپور انداز سے گزارنے پر یقین رکھتے تھے۔ میں کس کس یاد کو آواز دوں؟

در و دیوار پہ اک حسرت سی برستی ہے قتیلؔ
جانے کس دیس گئے پیار نبھانے والے

وہ خوبصورت جمالیاتی ذوق رکھتے تھے۔ ہمیشہ ہسپتال اور کلینک میں تازہ پھول یا کسی درخت کی سرسبز ٹہنی توڑ کر گلدان میں ضرور رکھتے۔ انہیں کھلتی بہار کے سبھی پھولوں اور رنگوں سے پیار تھا۔

بچھڑا کچھ اس ادا سے کہ رت ہی بدل گئی
اک شخص سارے شہر کو ویران کر گیا

آج جب کہ اقدار کی بوسیدگی نے شعور و محبت کے درمیان ایک کچے دھاگے کا ناتا بھی نہیں چھوڑا ہے۔ ڈاکٹر مقبول اختر محبتیں بانٹتے پھرتے تھے۔

ع تم کیا گئے کہ روٹھ گئے دن بہار کے

ایک روز مجھ سے کہنے لگے:

''شاعری تم بھاگتے دوڑتے کرتے ہو۔ نثر کی روٹی کچی اتار لیتے ہو۔ صحافت نما نثر نگاری کا مقصد؟ شاعری پر سنجیدگی سے توجہ دو۔''

میں مدرسوں، ان کے طرزِ تعلیم اور معاشرے پر ان کے اثرات پر تحقیق کر رہا تھا کہ سارا مسودہ منگوا لیا اور کہنے لگے کہ کوئی اور کاپی محفوظ ہے؟ میں نے انکار کیا تو مسودے کو

دراز میں بند کیا اور فرمایا۔

''ہمیں آپ سے محبت ہے، کچھ دن اور جی لو!''

پھر وہ مسودہ کبھی واپس نہ کیا۔ وہ ہمیشہ ڈنکے کی چوٹ پر کہتے تھے کہ پاکستان میں بہت خون بہے گا۔ مذہب کے ٹھیکیدار اس سرزمین کو لہو رنگ کیے بغیر باز نہ آئیں گے اور ہمارے عساکران کی حمایت میں بہت آگے چلے گئے ہیں اور وہ وقت دور نہیں جب دونوں باہم متصادم ہوں گے۔

ڈاکٹر مقبول اختر کی رحلت، ہماری زندگی کی کتاب میں دکھوں، آہوں اور غموں کے کئی باب رقم کر گئی ہے۔ ان کا وژن، حوصلہ، حق گوئی و بے باکی کی داد تو ان کے مخالف بھی دیتے تھے۔ ان کی موجودگی ہمارے لیے تقویت کا باعث تھی۔

میری متاعِ جان، والدہ محترمہ کا انتقال ہوا تو ہسپتال سے میں نے ڈاکٹر مقبول صاحب کو فون کیا۔ ایک لمبی خاموشی کے بعد کہنے لگے:

''ایتھے کینے رہ جانا اے!'' اوناں دی قبر دے نال ہور پیاریاں دیاں قبراں نے۔

میں والدہ محترمہ کے ساتھ عمرہ کی ادائیگی کے لیے گیا۔ واپس آ کر ملنے گیا تو ابھی میں نے شیو نہیں کی تھی۔ کہنے لگے:

''مولانا یونس ایاز، باہر کا حال تو ہم دیکھ رہے ہیں۔ اندر کا حال 'رب جانے' یا 'تو جانے'''

میں نے کہا:

''انشاءاللہ آپ بھی عمرہ کے لیے تشریف لے جائیں گے۔'' تو ہنس کر کہنے لگے:

''لگدا اے میری بیگم نے تینوں وکیل کر لیا اے۔''

پھر وہ عمرہ کے لیے گئے لیکن بیگم ڈاکٹر مقبول اختر وہیں پر شدید بیمار ہو گئیں اور واپس آتے ہی ان کا انتقال ہو گیا۔

ڈاکٹر مقبول صاحب بمعہ بیگم صاحبہ میری شادی پر تشریف لائے۔ میں نے شکریہ ادا کیا تو فرمانے لگے:

''تیرا دوجا ویاہ اے۔ میں بیگم نوں وکھان لے آیا واں۔''

ڈاکٹر مقبول اختر نے عجیب قلندرانہ طبیعت پائی تھی۔ نہ کبھی کسی سے شکوہ، نہ شکایت۔ انہوں نے انتہائی نامساعد حالات میں بھی کبھی حوصلہ نہ ہارا تھا بلکہ ہمیشہ دوسروں کو حوصلہ بخشا۔

ڈاکٹر مقبول اختر جیسے پرصفت، پرخیال رفیق کی عظمتوں کے تمام 'مسلمان' قائل ہوئے اور محبتوں کے اسیر بھی۔ وہ ہمیشہ ہمارے ذہنوں میں روشن ستارے کی طرح جگمگاتے رہیں گے۔

ع لا کے رکھیو سرِ محفل کوئی خورشید اب کے

وہ میرا ہمدم، میرا مونس، میرا ہم راز بہت نفیس انسان تھا۔ ان کی یاد میں آج ہر لفظ روتا ہے۔ وہ ہمیشہ دوستوں کو خوش دیکھنا چاہتے کہ ایک نامور ماہرِ نفسیات بھی تھے۔ ایک دن کہنے لگے:

''تمہیں جمیلہ ہاشمی کا 'دشتِ سوس' نہیں پڑھنا چاہیے تھا۔ تم تو حسین بن منصور بننے کے منصوبے بناتے دِکھ رہے ہو۔ تمہاری آغول کدھر ہے؟ پہلے آغول کو ڈھونڈ لو۔''

محمود ثنا کو 'دشتِ سوس' منظوم کرنے کو کہا۔

ایک دن مجھے بہت جذباتی کر دیا۔ کہنے لگے:

''اب میری آواز عالمِ بالا سے آئے گی۔ تم یہی سمجھنا۔''

پھر میری طرف فون بڑھایا اور کہا:

''بیٹے کو منا کر گھر لاؤ۔ 'ایہہ پتر ہٹاں تے نہیں وکدے'۔''

میں متامل تھا۔۔۔ کہنے لگے:

''میرے اندر جھانک سکتے تو تمہیں پتا چلتا کہ کچھ محبتوں کے گوشے ادھورے ہیں۔ جاؤ، ابھی جاؤ، کہیں بہت دیر نہ ہو جائے۔''

پھر واقعی بہت دیر ہو گئی۔

اپنی چھوٹی بیٹی زرشی کے لیے وہ بہت متفکر رہتے۔ ڈاکٹر مقبول اختر کی بیماری اور علاج کے لیے، ان کی بڑی بیٹی ڈاکٹر زرقا۔۔۔ ان کے شوہر عامر عزیز۔۔۔ اور بچوں نے دن رات ایک کر کے حق ادا کر دیا۔ بہن منزہ اب تک یہ حق ادا کر رہی ہیں۔ بیٹیاں اور بہنیں شاید کسی اور ہی مٹی کی تخلیق ہوتی ہیں۔

منزہ بہن کی یادوں بتی 'پھول لاکھوں برس نہیں رہتے' کا ڈاکٹر بھائی اور اعلیٰ اقدار کے حامل مشرقی گھرانے کا تصور اب ناپید ہوتا جا رہا ہے کہ اس دور میں ہم بھاگ دوڑ رہے ہیں اور خوشیاں ہم سے کہیں پیچھے رہ گئیں ہیں۔ ڈاکٹر مقبول اختر خوشیاں بانٹتے بانٹتے شہرِ خموشاں جا بسے۔ دوسروں کے کام آنا اور اعلیٰ انسانی اقدار اور دوستی اور نظریہ کی پاسداری تو شاید ان کی فطرت تھی۔ اگر اللہ تعالیٰ باہمی محبت اور خوش اخلاقی کو عبادت کا درجہ دے اور اسے نجات کی شرط بنا دے تو!

ے داورِ محشر مجھے تیری قسم
عمر بھر میں نے عبادت کی ہے
تو میرا نامۂ اعمال تو دیکھ
میں نے انساں سے محبت کی ہے

ooo

رفتید، ولے نہ از دلِ ما

—زمان خان—

پاکستان کی حکمران اشرافیہ نے پہلے ہی دِن سے یہ فیصلہ کر لیا تھا کہ اس ملک میں ترقی پسند سیاست کو پنپنے نہیں دینا۔ آج تاریخ نے یہ ثابت کر دیا ہے کہ جب بھی ترقی پسندوں نے اشرافیہ کی قیادت میں ترقی پسند سیاست کرنے کی کوشش کی تو انھیں نقصان ہوا لوگوں کا شعور آگے بڑھنے کی بجائے پیچھے گیا۔ یہی وجہ تھی کہ میجر اسحاق اور ان کے ساتھیوں نے نیشنل عوامی پارٹی سے الگ ہو کر پاکستان مزدور کسان پارٹی بنائی۔ مقبول اختر کی زندگی کو پاکستان کی ترقی پسند تحریک کی تاریخ کو جانے بغیر نہیں سمجھا جا سکتا لیکن یہ ایک طویل سفر ہے اس لیے میں اس کو کسی اور وقت کے لیے اُٹھائے رکھتا ہوں۔

یار کوئی لطیفہ سناؤ۔۔۔ ڈاکٹر مقبول اختر ملتے ہی کہتے۔۔۔ لطیفہ ''شاید پرانا ہے یا ہم نے پہلے سن رکھا ہے۔'' جواباً دوست کہتے۔ مقبول کا جواب ہوتا۔ لطیفہ کبھی پرانا نہیں ہوتا اور اگر آپ نے پہلے سن رکھا ہو تو اخلاق اور تہذیب کا تقاضا اور لطیفہ سننے کے آداب یہ ہیں کہ آپ ہمیشہ جواب دیں کہ آپ نے پہلے یہ لطیفہ کبھی نہیں سنا۔۔۔ یہ تھے ہمارے ساتھی

اور دوست ڈاکٹر مقبول اختر۔۔۔ میں سنجیدگی سے سمجھتا ہوں کہ اگر میں اس سے آگے کچھ بھی نہ لکھوں تو مقبول کی شخصیت ان چند لائنوں سے سمجھی جا سکتی ہے۔ یہ سطور مقبول کی شخصیت کی مکمل عکاسی کرتی ہیں کہ وہ کتنے عظیم انسان تھے۔ ان میں حسِ مزاح کتنی تھی اور وہ کتنے مہذب، حساس اور دوسروں کے جذبات کا خیال رکھنے والے تھے۔

دِل تو چاہتا ہے کہ بات یہاں ختم کر دوں مگر ڈر ہے کہ میری بہن منزہ مجھے معاف نہیں کریں گی۔ لہٰذا ان کے احترام میں کچھ مزید عرض کرنے کی کوشش کروں گا۔

میں کافی دیر سوچتا رہا کہ اس واقعہ کا ذکر کروں کہ نہ مگر مقبول کی شخصیت کو سمجھنے کے لیے اس کا ذکر ضروری ہے۔ ایک رات کو ایک ساتھی ایک بجے کے قریب میرے گھر آیا کہ اس کے والد قاتلانہ حملے میں شدید زخمی ہو کر ہسپتال میں زندگی اور موت کی کشمکش میں مبتلا ہیں۔ میرا تو کسی ڈاکٹر کے ساتھ کوئی تعلق نہیں تھا۔ میں ان کو لے کر فوراً ڈاکٹر مقبول کے گھر گیا اور وہ شب خوابی کے لباس میں ہی ہمارے ساتھ ہسپتال گیا۔

ایک ایسے شخص کے بارے میں لکھنا جس سے آپ کے کئی رشتے ہوں بہت ہی مشکل کام ہے مگر جس کے بارے میں آپ کو یقین نہ ہو کہ وہ آپ سے ہمیشہ کے لیے بچھڑ گیا ہے اس کے بارے میں لکھنا بہت ہی مشکل کام ہوتا ہے۔

ڈاکٹر مقبول اختر سے پہلا اور دائمی سیاسی رشتہ تھا گو اس کے بعد کئی رشتے پیدا ہو گئے مگر اوّل اور آخر دائمی رشتہ سیاسی ہی رہا۔

لاہور سے ایک دِن میجر صاحب اچانک مزدور کسان پارٹی کا رسالہ جسے سرکلر کا نام دیا گیا تھا اُٹھا کر لائل پور لے آئے اور اس کی اشاعت کی ذمہ داری لائل پور کی پارٹی کے ذمہ لگ گئی۔ ظاہری طور پر تو یہ ذمہ داری میجر صاحب ہی کی تھی مگر غلام نبی کلّو صاحب کے علاوہ مقبول اختر اور منظور نیازی (ان سب کو مرحوم لکھنے کو دِل نہیں چاہتا) بھی اس ادارتی بورڈ کے رُکن تھے۔ وہ زمانہ کمپیوٹر کا نہیں تھا لہٰذا پہلا کام تو کاتب تلاش کرنا تھا اور پھر اس کی

اشاعت کے کئی مراحل ہوتے تھے۔اس کی وجہ یہ تھی کہ اس دور میں پارٹی سرکلر جیسے بے ضرر پرچہ کو بھی سامراج اور اس کی پٹھو حکومت بم بنانے کا نسخہ ہی سمجھتے تھے اور اس کے نکالنے والوں کے بارے میں ان کا رویہ بھی ''دہشت گردوں'' سے نپٹنے والا تھا۔اس سے پہلے کہ میں آپ کو بتاؤں کہ کس طرح منظور نیازی کو سرکلر کے پرنٹر نے ہی بھٹو مخالف تحریک کے دوران خود مخبری کر کے گرفتار کروا دیا تھا میں آپ کو بتاتا چلوں کہ کتابت کی غلطیاں لگانے کا کام ڈاکٹر مقبول، منظور نیازی اور میرے ذمہ تھا۔ہم پرچہ کو پریس میں بھیجنے سے پہلے رات گئے تک اس کی غلطیاں اور پھر غلطیوں کی غلطیاں لگاتے تھے اور جب یہ کام مکمل ہو جاتا تو پھر اس کا جشن گرمیوں میں آئس کریم اور سردیوں میں کھیر یا حلوہ کھا کر مناتے تھے۔آپ پریشان نہ ہوں اس زمانے میں ڈاکٹر صاحب ایک قسم کے 'مولوی' تھے وہ تو بھلا ہو ان کی ہارٹ سرجری کا کہ اس سے ان کی قلب ماہیت بھی ہو گئی اور انھوں نے عام آدمیوں والی زندگی بسر کی، جو ایک بہت ہی صحت مند تبدیلی تھی۔جس کے سہارے وہ کئی سال جیے۔

کیونکہ ڈاکٹر صاحب طبیب بھی تھے اس لیے یقین کریں کہ ہمیں احساس ہی نہیں ہوا کہ ہمارے خاندان کی صحت کی دیکھ بھال کی ذمہ داری ڈاکٹر مقبول اور ڈاکٹر احسان پر تھی۔آج کے دور میں احساس ہوتا ہے کہ یہ کتنا پیچیدہ اور مشکل کام تھا کیونکہ وہ ساری پارٹی کے کامریڈوں کی صحت کی دیکھ بھال کرتے تھے۔میں ڈاکٹر احسان کی درازیٔ عمر کی دُعا کرتا ہوں کیونکہ وہ یہ کام آج بھی اسی اخلاق، جذبہ اور لگن کے ساتھ کر رہے ہیں۔

باقی نشتر میڈیکل کالج کے زمانے کا حال تو ڈاکٹر احسان ہی بتا سکتے ہیں۔ڈاکٹر مقبول اختر، ڈاکٹر احسان الحق اور میرے تایازاد بھائی ڈاکٹر جان محمد سے ایک سال سینئر تھے۔

جیسا کہ درمیانے طبقہ کی اکثریت کو زندہ رہنے کے لیے بہت سارے جتن کرنے پڑتے ہیں مقبول کو بھی تلاشِ روزگار کے لیے مسقط جانا پڑا مگر جلد ہی واپس آ گئے اور پرائیوٹ پریکٹس شروع کر دی۔میجر صاحب ہمیشہ کہتے تھے کہ (ڈاکٹر مقبول کے والد اور ان کے

بہنوئی) ڈی ایس پی غلام رسول ایک ایماندار افسر تھے۔

مقبول کو مارکسسٹ فلسفہ ننھیال کی طرف سے ورثہ میں ملا۔میجر اسحاق ایم اے او کالج امرتسر میں اس کے گھائل ہو گئے تھے گو بعد میں وہ فوج میں شامل ہو کر دادِ شجاعت حاصل کرتے رہے مگر انور ماموں تو پارٹی کے کل وقتی کارکن تھے مگر بعد میں ایسے رخصت پر گئے کہ اسی حالت میں اس دنیا سے کوچ کر گئے۔میجر اسحاق کبھی کبھی بابا گورو نانک کے حوالے سے اپنے اور مقبول کے رشتہ کا ذکر کرتے تھے۔

میجر اسحاق نے جب اپنے ہندسندھ کے فلسفہ کو عوامی سطح پر پیش کرنے کا ارادہ کیا تو انہوں نے اس کام کے لیے مقبول اختر کو ہی چنا۔گو وہ اپنے ڈرامہ 'مُصلّی' میں اس کو پیش کر چکے تھے۔مجھے یاد ہے حلقہ اربابِ ذوق کا سالانہ جلسہ کارپوریشن ہال میں تھا اور بنیادی مقالہ ڈاکٹر مقبول اختر کو پڑھنا تھا ہم لائل پور سے چند ساتھی لنگر لنگوٹ کس کر مقبول کو اخلاقی امداد پہنچانے کے لیے میجر اسحاق کی سربراہی میں لاہور گئے۔یقین کریں کہ مقبول اختر کے تھیسس کی بڑے سینئر دانشوروں کو بھی داد دینا پڑی۔

ڈاکٹر مقبول اختر ایک صاحب طرز لکھاری تھے ان میں ایک خاص قسم کی حس مزاح تھی۔انہیں اردو اور انگریزی دونوں زبانوں پر عبور حاصل تھا۔جن لوگوں نے ان کے 'آؤٹ لک' میں مضمون پڑھے ہیں وہ جانتے ہیں کہ ان کی زبان میں کتنی کاٹ تھی اور انہیں شستہ انگریزی میں اپنی بات کہنے کا ملکہ حاصل تھا۔لکھنے کا کام انہوں نے کبھی بھی نہیں چھوڑا اور آخری سالوں تک ایڈیٹر کے نام خطوط کا سلسلہ جاری رکھا۔مگر میں سمجھتا ہوں کہ انہوں نے بدقسمتی سے بہت کم لکھا مگر جو بھی لکھا وہ خوب لکھا۔اب ان کی تحریروں کو ڈھونڈ کر کتابی شکل دینے کی سخت ضرورت ہے۔میری تجویز ہے کہ منزہ کو مقبول کی ساری تحریریں اکٹھی کر کے چھاپ دینی چاہییں۔

ڈاکٹر مقبول کا کہنا تھا کہ اگر آپ کے ذہن میں کوئی خیال آئے تو فوراً اس کو لکھ کر

پرچی ڈال لیا کریں کیونکہ بعد میں لاکھ آپ اسے یاد کرنے کی کوشش کریں وہ آپ کو یاد نہیں آتا۔لہٰذا ڈاکٹر مقبول اختر کی کلینک کی میز کی دراز میں جہاں وہ مریضوں کی فیس اور کل وقتی کارکنوں کا مشاہرہ رکھتے تھے وہاں پرچیوں کی بھی ایک بڑی تعداد ہوتی تھی۔

یہ کل کی بات ہے کہ ہم صفدر کو لاہور بیاہنے گئے اور اس کے بعد منزہ بہن کی شادی بھی میجر اسحاق کے اکلوتے بیٹے میجر سلیم کے ساتھ ہوگئی۔مگر کیا پتہ تھا کہ صفدر ہم کو اتنی جلدی چھوڑ جائے (ڈاکٹر مقبول کا چھوٹا بھائی) گا۔مجھے یاد ہے کہ صفدر کے جنازے کے موقع پر مقبول کہہ رہا تھا کہ We are now in the firing line

مجھے یاد ہے کہ مقبول کی اوپن ہارٹ سرجری تھی اور اس زمانے میں یہ کام صرف راولپنڈی میں ہی ہوتا تھا۔جس دن مقبول کا آپریشن تھا تو ڈاکٹر احسان کا خیال تھا کہ ہمیں آپریشن سے پہلے مقبول کو ضرور مل کر آنا چاہیے لہٰذا ہم لوگ مقبول کو ملنے گئے۔یقین کریں کہ آپریشن سے چند گھنٹے پہلے تک اس کی حس مزاح زوروں پر تھی اور اسے اس بات کی قطعاً پرواہ نہیں تھی کہ اس کی چیر پھاڑ ہونے والی ہے۔دلچسپ بات یہ ہے کہ جس دن مقبول کا آپریشن تھا اسی دن جنرل ضیا الحق نے ہسپتال کا دورہ کیا اور ڈاکٹروں نے مقبول کو بھی جنرل ضیا کے سامنے پیش کیا۔ہم کئی سال تک مقبول کی اس ملاقات کا مذاق اُڑاتے رہے۔

میں جب مزدور کسان پارٹی میں شامل ہوا تو ایک شام منظور نیازی صاحب نے منصور آباد میں دوستوں کا اکٹھ کیا اور مجھے بھی بلایا وہاں دوستوں نے سوال کیا کہ تم تحریک میں کیوں شامل ہوئے تو میرا دو لفظی جواب تھا کہ یہ ایک شعوری فیصلہ تھا کوئی طبقاتی مجبوری نہیں تھی،مقبول کا بھی یہ شعوری فیصلہ تھا کوئی طبقاتی مجبوری نہیں تھی اور اس فیصلہ پر وہ ساری عمر قائم رہا۔لوگ آج کل پوچھتے ہیں کہ جس مشن کو تم لوگ لے کر نکلے تھے اس میں کامیاب نہیں ہوئے تو اس کا جواب یہ ہے کہ اپنے نظریہ کی وجہ سے ہم لوگ سرمایہ داری نظام کی لوٹ مار کا حصہ بننے سے بچے رہے۔ہم نے کسی کا حق نہیں مارا بلکہ عوام کو حق دلوانے کے لیے

ساری عمر لڑتے رہے، ناانصافی اور بے ایمانی کے نظام کی آلائشوں سے بچے رہے۔سب سے بڑی کامیابی یہی ہے کہ ایک اچھے انسان کی طرح زندگی گزارنے کی کوشش کی۔۔۔ انگریزی میں کہتے ہیں کہ rat race سے بچے رہے۔اس سے بڑی کیا بات ہے کہ کسی کا حق نہیں چھینا۔کسی کا مال ہڑپ نہیں کیا۔کسی کی ٹانگ نہیں کھینچی۔کسی کی برائی یا چغلی نہیں کی۔کسی کمزور پر ہاتھ نہیں اٹھایا۔

فیض احمد فیض سے میجر صاحب کی بہت ذاتی دوستی تھی وہ ایم اے او امرتسر کالج میں فیض صاحب کے شاگرد تھے۔پچھلی صدی کی ستر کی دہائی میں فیض صاحب کی سالگرہ کا لائلپور میں پروگرام بنایا گیا دلچسپ بات یہ ہے کہ جس شخص کو میجر صاحب نے فیض سے نوکری دلوائی تھی اس نے فیض صاحب کے خلاف سٹیج سے مضمون پڑھنا شروع کر دیا۔فنکشن کے بعد فیض صاحب ساقی صاحب کے گھر پیپلز کالونی چلے گئے۔ہم نے ڈاکٹر احسان سے خواہش کا اظہار کیا کہ ہمیں ساقی صاحب کے گھر لے چلیں۔ساقی صاحب،ڈاکٹر احسان کے دوست اکرم کے بہنوئی تھے اور فیض صاحب لائلپور میں انہیں کے گھر رہتے تھے۔ہم پیدل پیپلز کالونی گئے ابھی تھوڑی دیر ہی گذری تھی کہ ایک ساتھی (میں جان بوجھ کر نام نہیں لکھ رہا کیونکہ وہ ساتھی بھی اب اس دنیا میں نہیں ہے) نے میجر صاحب کے بارے میں نازیبا زبان استعمال کی جس کی وجہ سے ہم فوراً وہاں سے واپس چلے آئے۔مقبول اختر کا صبر اور ضبط قابل دید تھا۔

مجھے آخری دنوں میں ان سے ملنے کا اتفاق ہوا،ڈاکٹر مقبول لوگوں کے ذہنوں کا علاج کرتے تھے مگر خود ان کے ذہن پر اثر ہوا،میں نے اس بات کو نوٹ کیا کہ وہ ایک فقرے میں کئی زبانوں کے الفاظ استعمال کر رہے ہیں۔پنجابی ماں کی زبان تھی،اردو اور انگریزی پڑھائی کی زبان تھی،وہ عرب میں رہے اس لیے کچھ عربی بھی بولتے تھے اور ادب سے تعلق کی وجہ سے انہیں فارسی سے بھی لگن تھی تو ان سب زبانوں کو ایک ساتھ بولتے تھے غالباً مختلف

زبانوں کو الگ الگ رکھنے والے خانہ میں کچھ معاملہ گڑ بڑ ہو گیا تھا، یہ تو کوئی ماہرِ نفسیات ہی بہتر بتا سکتے ہیں کہ یہ کیوں ہوتا ہے؟

میں نے نہیں دیکھا مگر کہنے والے کہتے ہیں کہ ڈاکٹر صاحب بہت ہی خوش لباس تھے، مگر جیسا کہ ہوتا ہے کہ نظریہ انقلاب نے انہیں ڈی کلاس نہیں ری کلاس کر دیا تھا گو دل کے آپریشن کے بعد انہوں نے کچھ کچھ نارمل زندگی اختیار کر لی تھی۔

موت ایک حقیقت ہے مگر پتہ نہیں کیوں آدمی کو یقین نہیں آتا، بعض لوگ جب دنیا سے رخصت بھی ہو جاتے ہیں تو یوں محسوس ہوتا ہے کہ وہ کسی روز آپ کو حیران کر دیں گے اس کی غالباً وجہ یہ ہوتی ہے کہ جس مشن کے لیے انہوں نے زندگی گذار دی ہوتی ہے۔ وہ مشن ابھی زندہ ہوتا ہے اور اس دوڑ (ریلے ریس) میں مشعل کو لے کر کوئی دوسرا کھلاڑی دوڑ رہا ہوتا ہے۔

ڈاکٹر مقبول اختر ایک Political Bird تھے۔ انہوں نے ساری زندگی مظلوم اور پسے ہوئے طبقات، افتادگانِ خاک کی آزادی کی جنگ لڑی اور اسی جدوجہد میں اس دنیا سے کوچ کر گئے مگر میری نظر میں وہ ققنس (اسی کی راکھ سے) کی طرح بار بار جنم لیتے رہیں گے جو کوئی بھی مقبول کے راستہ پر چلے گا وہ مقبول ہی ہوگا اور یہ سلسلہ ہمیشہ جاری رہے گا۔

آج کی دنیا میں گو اس مشن کے لوگوں میں اضافہ نہیں ہو رہا مگر یہ ایک وقتی مرحلہ ہے۔

میری نظر میں اگر کوئی شخص اپنے مشن پر قائم رہتا ہے گو وہ اپنے مقصد میں کامیاب نہیں بھی ہوتا تو یہ بہت بڑی بات ہوتی ہے۔

مقبول سے ملنے کے بعد چائے میں شکر کا استعمال بند کر دیا مگر میں آج بھی مقبول کی شیریں باتیں محسوس کرتا ہوں۔

ooo

ڈاکٹر بھائی

—پروفیسر شمیم ظفر رانا—

استادِ محترم، ڈاکٹر انوار احمد (نامور افسانہ نگار، نقاد) نے مجھے جب میجر اسحاق محمد کے ڈراموں پر تحقیقی کام سونپا تو میں نے بھی ہر نو آموز محقق کی طرح بڑے جوش و جذبے سے مطلوبہ معلومات اکٹھی کرنا شروع کر دیں۔ نتیجتاً جلد بلکہ فوراً ہی مجھے یہ معلوم ہو گیا کہ فیض احمد فیض کے ہمراہ راولپنڈی سازش کیس میں ملوث کیے جانے والے میجر اسحاق محمد کا تعلق لائل پور کی تحصیل جڑانوالہ کے گاؤں 644 گ ب کوٹ صوفی سے تھا اور اب فیصل آباد کے معروف سائیکاٹرسٹ ڈاکٹر مقبول اختر میجر صاحب کے بھانجے ہیں نیز یہ کہ مصنفہ منزہ سلیم میجر اسحاق کی بہو اور ڈاکٹر مقبول اختر کی بہن ہیں۔ ان کی تصنیف 'پھول لاکھوں برس نہیں رہتے' پڑھ کر ان سے ملنے کی خواہاں تو تھی ہی، اب ان سے ملاقات کا ایک اور بہانہ ہاتھ لگا۔

بہر حال جی۔ سی یونیورسٹی فیصل آباد میں بیٹھے بٹھائے، ملنے والی ان فوری معلومات سے اک گونہ اطمینان ہوا اور اگلے ہی روز میں ڈاکٹر پروین کلّو کے ہمراہ ڈاکٹر مقبول اختر کے کلینک پر پہنچی۔ مسکراتی ذہین آنکھوں والی ایک متین شخصیت ہمارے سامنے تھی۔ ہم نے مدعا بیان کیا

توانہوں نے اظہارِ مسرت فرمایا اور ہر ممکن تعاون کی یقین دہانی کرواتے ہوئے 'ابتدائی امداد' کے طور پر اپنی میز کی دراز میں موجود مواد ہمارے سپرد کیا اور 'باقی آئندہ' کے لیے وقت متعین فرمایا۔ ہم معین وقت پر 'اگلی قسط' کی وصولی کے لیے پہنچیں تو ان کے گرد کچھ طالب علم نما نوجوان موجود تھے۔ ہم نے ڈاکٹر صاحب کے خیالات سے خاطر خواہ استفادہ کی غرض سے موبائل کا ریکارڈر آن کر دیا۔ وہ تعلیم اور نفسیات کے شعبہ میں متعارف ہونے والی اصطلاح Dyslexia پر بات کر رہے تھے کہ اس کا لغوی مفہوم الفاظ کا غیر منظم اور ناموزوں عارضہ ہے جس کی وجہ سے طلبہ کو الفاظ پڑھنے، یاد کرنے اور لکھنے میں دشواریوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے اس کی وجوہات Neurological ہوتی ہیں۔۔۔

"سر کیا 'بھولنا' بھی نفسیاتی عارضہ ہے؟"

ایک نوجوان کے اس سوال پر ڈاکٹر صاحب مسکرائے اور معنی خیز انداز میں بولے:

"جو آپ کو بھول جائے، اسے آپ بھی بھول جائیں۔"

اس جواب پر کلینک جوان قہقہوں سے لبریز ہو گیا۔

؎ یاد کرنے کی ہم نے حد کر دی
بھول جانا ترا کمال سہی

اور فیض نے بھی تو کہا ہے:

؎ وقفِ حرماں و یاس رہتا ہے
دل ہے اکثر اداس رہتا ہے
تم تو غم دے کے بھول جاتے ہو
مجھ کو احسان کا پاس رہتا ہے

(فیض احمد فیض کی شاعری سے ڈاکٹر صاحب بے حد متاثر تھے اور میجر اسحاق محمد کے تو فیض صاحب سے گھریلو مراسم تھے)

ڈاکٹر صاحب ایک دم سنجیدہ ہوئے۔

"بھولنا ایک نفسیاتی عارضہ ہے اور یہ کسی نفسیاتی الجھن کو ظاہر کرتا ہے۔"

کچھ روز بعد، آرٹس کونسل میں منزہ سلیم کی کتاب کی تقریب رونمائی میں ڈاکٹر صاحب کو سنا تو ان کے ادبی ذوق کا مزید اندازہ ہوا۔ میں نے اس جذباتی سی تقریب میں اپنے بھائی رفیق رائے مرحوم کو یاد کر کے آنسو بہائے تو ڈاکٹر صاحب اپنے بھائیوں کی یاد میں آبدیدہ ہوئے۔ بہر حال اس تقریب کے بعد منزہ سلیم میری 'منزہ آپی' اور ان کے ڈاکٹر بھائی 'میرے' ڈاکٹر بھائی ہو گئے۔

آٹھ فروری ۲۰۱۰ء کی ایک بجھی سی شام، میں یونیورسٹی میں ایم۔ فل کی کلاس میں تھی کہ منزہ آپی کا فون آیا کہ ڈاکٹر بھائی، کراچی سے دماغ کے کامیاب آپریشن کے بعد شام کی فلائٹ سے سیدھے میرے گھر آرہے ہیں اور میں نے اسی خوشی میں چند قریبی دوستوں کو مدعو کیا ہے۔ تمہیں ضرور آنا ہوگا۔ چنانچہ کلاسز کے بعد آپی کے جدید اور کشادہ گھر پہنچی تو یہ جان کر خوشگوار حیرت ہوئی کہ ڈاکٹر بھائی تشریف لا چکے ہیں۔ تھری پیس سوٹ میں ملبوس، ایسا ہشاش بشاش Serious مریض کبھی نہیں دیکھا تھا۔ سنگین بیماری اور ہزاروں میل کی مسافت طے کرنے کی تکان قطعاً ہویدا نہ تھی۔ البتہ ان کی قوت سماعت مکمل طور پر ختم ہو چکی تھی۔ منزہ آپی نے وائیٹ بورڈ پر لکھ کر ان سے پوچھا۔

"یہ کون ہیں؟"

"شمیم ظفر رانا" انہوں نے اپنی مخصوص مسکراہٹ کے ساتھ میرا پورا نام لیا تو بے حد خوشی ہوئی۔ اسی وقت، حال ہی میں اپنی مرتب کردہ میجر اسحاق کی کتاب 'شتر غمزے' اپنے دستخط کر کے مجھے دی تو گویا اس 'آخری ملاقات' کو سند عطا کر دی۔ قریبی رشتہ داروں کے علاوہ قرابت داروں کی آمد شروع ہو چکی تھی۔ معروف کرکٹ کمنٹیٹر محمد ادریس، مشہور معالج ڈاکٹر احسان الحق بھی موجود تھے جو کہ ڈاکٹر بھائی کے نہایت عزیز دوست ہیں۔ آپی نے پر تکلف

کھانے کا اہتمام کر رکھا تھا۔ ایک روایتی مشرقی بہن کا اپنے 'ویر' کے لیے اظہارِ محبت دیدنی تھا۔

اگست کے اوائل میں ملتان اور فیصل آباد کی گرمی کی شدت سے گھبرا کر چند روز کے لیے مری گئی تو آپی کا فون آیا کہ ڈاکٹر بھائی۔۔۔

ایک غیر معمولی خبر، انہوں نے خلافِ معمول مختصر الفاظ میں قدرے تاخیر سے دی اور جواباً میں بھی خلافِ عادت خاموش رہی۔ مری کے سبزہ زاروں نے اداسی اوڑھ لی اور دراز قامت چیڑ، خزاں کی آغوش میں چلے گئے۔

ع یہ مسافر لوگ، پت جھڑ میں چلے جاتے ہیں دور۔۔۔

یہ مضمون لکھنا میرے لیے کارے دارد تھا، مگر یہ ایک عالمی سچ ہے کہ کچھ کام بادلِ نخواستہ بھی کرنے پڑتے ہیں۔

○○○

صاحبِ علم

—صبیحہ ادریس—

یہ 1966ء کی بات ہے کہ ادریس ریڈیو پاکستان میں پروڈیوسر تھے۔ میری شادی کو دو سال ہو چکے تھے جب ادریس کو خاندانی مفاد کی خاطر براڈکاسٹنگ کو خیرباد کہہ کر میرے بھائی کے ساتھ کاروبار میں شریک ہونا پڑا۔ ہم کراچی سے فیصل آباد آئے اور یہاں اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم سے شکر کے ساتھ آباد ہیں۔ لائل پور اور پھر بعد میں فیصل آباد۔ میں سوچتی ہوں اگر ڈاکٹر بھائی تک رسائی نہ ہوتی تو کیا ہوتا۔ ڈاکٹر بھائی گلبرگ میں ہمارے گھر کے پاس ہی کلینک کرتے تھے۔ ادریس کا تعارف ڈاکٹر بھائی سے محمد اسلم صاحب کے میڈیکل سٹور پر ہوا۔ ادریس کا ایک لطیفہ ڈاکٹر بھائی کو ایسا پسند آیا کہ دونوں ایک دوسرے کا خیال کرنے والے اور پھر بہت قریب ہو گئے۔ ڈاکٹر بھائی، ادریس کے کرکٹ کلب میں باقاعدہ شامل ہوئے اور دل لگا کر کرکٹ کھیلی ایسٹرن کرکٹ کلب کے صدر بھی رہے۔

میرے شوہر کو کرکٹ کمنٹیٹر بنانے میں ان کا بڑا ہاتھ تھا وہ علم کا دریا تھے ہر شعبہ میں سند کا درجہ رکھتے تھے اور علم کے سلسلہ میں کھل کر مدد کرتے تھے۔ ملتے جلتے ہمارا ڈاکٹر مقبول کے خاندان سے ایسا تعلق ہوا کہ ہم ان کے خاندان کا حصہ سا بن گئے۔ ہمیشہ ہنستے رہنے والے

ڈاکٹر بھائی نے ہمارے گھر میں ایسی بابرکت خوشگوار خوشبو بکھیر دی جو اُن کے رُخصت
ہونے کے بعد بھی آئے چلی جاتی ہے۔ ڈاکٹر مقبول اپنی تین بچیوں کے ساتھ ہماری ہر
تقریب میں موجود ہوتے۔ ہمیں ڈاکٹر بھائی سے اتنا کچھ ملا جو شاید اپنوں سے نہ مل سکا۔
کبھی سوچتی ہوں میرے اِتنے ہنس مکھ بھائی کو اتنا بہت سارا ''غم'' کیوں ملا؟ میں نے اپنی
زندگی میں کسی ایک بھائی کو اتنا غم اُٹھاتے نہیں دیکھا۔ تمام زندگی انھوں نے سانحوں کے
ساتھ گزاری وہ اس طرح جیے

ے چلا جاتا ہوں ہنستا کھیلتا موجِ حوادث میں
اگر آسانیاں ہوں زندگی دُشوار ہو جائے

1985ء میں وہ دِل کے عارضہ میں مبتلا ہو کر بائی پاس کے لیے روالپنڈی گئے۔
کتنے لوگ تھے جن کا مشورہ تھا کہ وہ انگلینڈ یا امریکہ جائیں، لیکن ڈاکٹر بھائی کو وطنِ عزیز کی
مٹی سے پیار تھا اور ہنرمند لوگوں میں ان کا کامل یقین تھا۔ ڈاکٹر بھائی نے کسی کی نہ مانی اور
پاکستان میں بائی پاس کرایا۔ یاد رہے کہ ان دِنوں پاکستان میں بائی پاس شاذ شاذ ہوتے
تھے۔ پنڈی جانے سے قبل انھوں نے مجھ سے کہا 'بھابھی سن لو میں گیا اور آیا تیاری کر لو
واپس آ کر میں آپ کے ہاتھ کے بنے ہوئے اچھے اچھے کھانے دِل بھر کر کھاؤں گا۔''

اللہ کے کرم سے جب کامیاب علاج کے بعد فیصل آباد آئے تو آج بھی ان مجلسوں
کی یاد آتی ہے جس میں ڈاکٹر مقبول اختر ہمیشہ اپنے بچوں کے ساتھ، ڈاکٹر احسان الحق،
پروفیسر رانا ارشاد، ڈاکٹر فیاض محمود آتے اور رات گئے تک محفل جمی رہتی۔ علم و دانش کے یہ
لوگ پتہ نہیں کن موضوعات پر پڑھی لکھی گفت گو کرتے رہتے اور ادریس نیند سے باقاعدہ
لڑتے نظر آتے تھے۔ یہ عجیب بات ہے کہ میرا احساس یہ تھا کہ ادریس اس محفل کا حصہ ہوتے
ہوئے بھی حصہ نہ تھے یوں لگتا تھا کہ علم و دانش کی باتیں ان کے سر سے گزری جا رہی ہیں۔
ادھر میں اور مسز مقبول سوتے جاگتے باتیں کرتے رہتے۔ ظاہر ہے عورتوں کا مقبول موضوع

کوئی تیسری عورت ہی ہوتی یا نئے سوٹ اور ڈیزائن کی باتیں۔ ڈاکٹر بھائی کے بیوی بچوں
کے ساتھ ہمارا ایسا اعتماد تھا کہ ڈائری کے خانہ میں جہاں یہ لکھا ہوتا ہے کہ ''حادثہ کی صورت
میں کس کو اطلاع دیں'' تو اس میں ڈاکٹر مقبول اختر کا نام و پتہ لکھا ہوتا۔ چھوٹی چھوٹی باتوں
سے لے کر زندگی سلیقہ سے گزارنے، بچوں کی ٹھیک پرورش کے لیے میں جب اُن سے بات
کرنا چاہتی وہ وقت دیتے اور ہمیشہ بہت حوصلہ دیتے۔ وہ مجھے اور بھی پیارے اس لیے
ہوئے جب میرے بھائی عارف کبیر جعفری سے ان کی ملاقات ہوئی پھر ان دونوں کی اپنی
مزے کی محفلیں تھیں جو مجھے کبھی نہ بھولیں گی۔

ایسا بھی ہو سکتا ہے کہ آپ میری باتیں جو ڈاکٹر مقبول کے بارے میں پڑھ رہے
ہیں کہیں کہ یہ بکھرے ہوئے خیالات کیا ہیں؟ صبیحہ، ڈاکٹر مقبول کے بارے میں کہنا کیا
چاہتی ہیں؟ بات سچ ہے مَیں اُن کو دل سے یاد کرتی ہوں اُن کی مغفرت کے لیے دُعا کرتی
ہوں شاید اُس عظیم شخصیت کا ٹھیک خاکہ نہ پیش کر سکی پر یہ تو ادیبوں کا کام ہے۔ کچھ چیزیں
الفاظ کی صورت میں مَیں فراہم کر دیتی ہوں۔ جتنی عمدہ شکل آپ بنا سکیں بنالیں۔ حسین و جمیل،
دراز قد مسکراتا چہرہ، خوش لباس۔ اقدار کا پاسبان، صاحبِ علم، آتے ہیں جو کام دوسروں
کے۔

ooo

فیصل آباد کا ایک اور مسیحا رخصت ہوا

-پروفیسر صادق حسین-

فیصل آباد کا ایک مسیحا مختصر علالت کے بعد چپکے سے اس دنیا سے ہمیشہ ہمیشہ کے لیے رخصت ہو گیا، وہ اس فانی دنیا سے چلا گیا جسے مہاتما بدھ نے دکھوں کا گھر قرار دیا تھا۔ یہ وہ دنیا ہے جس میں ہر شخص غموں سے نڈھال اور دکھوں سے چور ہے۔ ہر شخص دل گرفتہ اور اپنے ماضی، حال اور مستقبل کے حوالے سے فکر مند ہے، اس شخص کا جنازہ اٹھا تو بادل برسا، ہر آنکھ اشکبار ہوئی، چہرے غم کی تصویر بنے اور دھاڑیں مارتے ہوئے غریب لوگ بار بار اس شخص کی طرف اشارہ کر رہے تھے، جو کبھی ان کا مسیحا اور زندگی کی آخری امید تھا، یہ ڈاکٹر مقبول اختر کا جنازہ تھا۔ جس نے اپنی زندگی انسانیت کے لیے وقف کر رکھی تھی۔ اس نے ساری عمر نہ جائیدادیں خریدیں، نہ کوٹھیاں بنائیں، نہ بڑی بڑی گاڑیوں کی حسرت کی، وہ ایک پولیس آفیسر کا بیٹا تھا، جس نے شانِ امارت کی بجائے، شانِ قلندری کو ترجیح دی۔ جس نے اس حرص و ہوس کی دنیا میں غریب پروری اور مزدوروں کے حقوق کی بات کی، وہ غریبوں کا حامی دوست اور محبوب مسیحا تھا، میرا ان سے کوئی تعلق تھا تو ڈاکٹر اور مریض کا، انسانیت کا، محبت کا اور علم دوستی کا مضبوط بندھن تھا۔ جس نے مجھے ڈاکٹر کا پرستار بنا دیا۔ ان سے میری پہلی ملاقات

بطور ایک مریض کے ہوئی۔ ڈاکٹر نے محبت بھری نظروں اور مسکراتے ہوئے چہرے سے کہا تم بالکل ٹھیک ہو جاؤ گے۔ میں ٹھیک ہوا، پھر صورتِ حال یہ ہوئی کہ میرے گاؤں کا کوئی شخص بیمار ہوتا تو میں اسے لے کر ڈاکٹر کے پاس پہنچ جاتا، اللہ تعالیٰ نے ڈاکٹر صاحب کو بے شمار خوبیوں سے نوازا تھا، ان کا لکھا ہوا نسخہ مریض کو صحت کی دولت سے مالا مال کر دیتا۔ ایک دن میں ایک ایسے مریض کو اپنے گاؤں سے لے کر آیا جس کا کوئی وارث نہیں تھا۔ میں نے ڈاکٹر صاحب کو اس کی غربت بتائی ڈاکٹر صاحب نے نہ صرف اس کی مالی مدد کی بلکہ اس کے فری علاج کا بھی بندوبست کیا۔ میں نے ان کے جنازے میں انسانوں کے ٹھاٹھیں مارتے ہوئے سمندر میں ایسے ہی لاوارث لوگوں کو دیکھا، جن کو کوئی بھی نہیں جانتا تھا۔ میں دل میں سوچ رہا تھا کہ آج کے انسان کے پاس وقت نہیں، دولت نہیں، تو دور دراز سے یہ لوگ کیوں آئے ہیں؟ پھر دل نے کہا کہ شاید یہ لوگ ساری عمر ڈاکٹر صاحب کو فیس تو نہ دے سکے ہوں گے لیکن آج وہ ان کے احسانوں کا قرض اتارنے کے لیے انھیں آخری سلام پیش کرنے آئے ہیں۔

ڈاکٹر صاحب نے ساری عمر غریبوں کے زخموں پر مرہم رکھا اور انھیں زندگی کی امید دکھائی۔ ڈاکٹر صاحب سائیکاٹری کے ماہر تھے، اسی لیے بعض جنونی مریض یہ کہہ رہے تھے کہ ڈاکٹر تو چلے گئے ہمارا کون پرسانِ حال ہوگا؟ ڈاکٹر صاحب تو منوں مٹی کے نیچے چلے گئے لیکن ان کی چھوڑی ہوئی روایات، کردار اور کارنامے شاید تاریخ کا حصہ بنیں۔

ڈاکٹر صاحب کے عزیز و اقارب کو تو شاید صبر آ جائے لیکن ان غریبوں کو کبھی قرار نہیں آئے گا جو معاشرے کی بے رحمی اور عدمِ تقسیمِ دولت کا شکار ہیں۔ شاید اسی لیے علامہ اقبال نے فرمایا۔

ے یہ علم یہ حکمت یہ تدبّر یہ حکومت
پیتے ہیں لہو دیتے ہیں تعلیمِ مساوات

ڈاکٹر صاحب نہ صرف جسمانی مریضوں کا علاج کرتے تھے بلکہ وہ مختلف اخبارات میں کالم اور مضامین لکھ کر غریب پروری کا روحانی پیغام بھی دے رہے تھے۔ انھوں نے غریبوں کے مسائل کے حوالے سے فکری اور عملی جدوجہد بھی کی۔ اللہ تعالیٰ ان کو جزا دے اور ان کے درجات بلند کرے۔ (آمین!)

(بشکریہ روزنامہ 'امن' ۱۹/اگست ۲۰۱۰ء)

○○○

سرخ سبز قندیلوں میں بسا طاق

—علامہ ضیاء حسین ضیاء—

وہ ۲۰۰۸ء کے موسمِ گرما کی شام تھی۔۔۔ حلقہ اربابِ ذوق فیصل آباد نے محترمہ منزہ سلیم کی نو آمدہ کتاب ''پھول لاکھوں برس نہیں رہتے'' کے اعزاز میں تقریبِ پذیرائی کا اہتمام کیا ہوا تھا۔۔۔ تھری سٹار ہوٹل چنیوٹ بازار کا ہال جس میں حلقے کے اجلاس عرصۂ طویل سے منعقد ہو رہے تھے، شہر کے مقتدر اور نوجوان ادیبوں، شاعروں سے کھچا کھچ بھرا ہوا تھا۔۔۔ نشستوں کی روزمرہ تعداد کے علاوہ اضافی نشستوں کا بھی اہتمام کیا گیا تھا۔۔۔ مجھے اچھی طرح سے یاد ہے کہ اس اجلاس کی صدارت، شہر کے معروف طبی معالج جناب ڈاکٹر احسان الحق کر رہے تھے، جن کا اپنا ایک منتخب اور چنیدہ ذوق اہلِ نظر تیئں محقق ہے۔ ساتھ میں منزہ سلیم تشریف فرما تھیں۔ ان کے ساتھ شہر کی مقبول ادبی شخصیت اور دانشورانہ شکوہ کی زندہ علامت۔۔۔ ڈاکٹر مقبول اختر صاحب اپنی ہمشیرہ کے ساتھ براجمان تھے۔ اسی صوفے کے آخر میں معروف دانش ور اور مصنف جناب پروفیسر اشفاق بخاری صاحب بھی رونق افروز تھے۔۔۔ شہر کی تقریباً تمام ہی قابلِ ذکر شخصیات موجود تھیں۔ میں نسبتاً ذرا تاخیر سے پہنچا اور سائیڈ والے صوفے میں احباب نے ازراہِ محبت اور مروّت میرے لیے جگہ

بنائی۔ میں اپنے حواس میں یکجا ہوا اور میری سماعت، میرے شعور سے رِشتہ و پیوند میں میسر ہوئی تو میرے اعتبارِ سماعت میں اُترنے والی آواز منزّہ سلیم کی تھی، جو اپنی کتاب سے چیدہ چیدہ نثر پارے پڑھ کر سنا رہی تھیں۔ دلچسپ یادوں کی پٹاری کھولے، منزّہ سلیم اپنے خاندان کے ساتھ گزارا اپنا بچپن، لڑکپن اور جوانی کے ایام کے ان وقتوں کو دُہرا رہی تھیں جو کسی سنہری بارش کی طرح آئے اور پھر گزر گئے۔ منزّہ سلیم کی مختصر تحریروں میں پتا نہیں کیا تاثیر اور جادو بیانی تھی کہ بار بار میری آنکھیں بھیگ رہی تھیں۔۔۔ منزّہ سلیم احباب کی سماعت کی دہلیزوں پر چراغ اور قندیلیں جلائے چلی جا رہی تھیں، کبھی عید کے تہوار پر گھر میں رنگ چھوتی کرنوں کی باتیں، کبھی شبِ برات، پھر پھلجھڑیاں اُڑاتی ہوئی یادوں کا تذکرہ، کبھی چودہ اگست پر پاکستان اور حب الوطنی کے حوالے سے اس دانشور گھرانے میں منڈیروں پر موم بتیاں جلانے کا قصہ۔۔۔ ان سب واقعات میں ایک بات جو قدرِ مشترک کے طور پر یکساں تھی وہ تھا منزّہ سلیم کا محبتوں اور رِشتوں میں ملبوس گھرانہ۔۔۔ جہاں ماں باپ کی لازوال محبت نظر آ رہی تھی اور منزّہ سلیم کے بھائیوں کی، بہن کے لیے محبت کی چھت اور جب منزّہ سلیم اپنے بھائیوں کی محبت کی اس چھت کو کڑی کڑی گن کر سنا رہی تھیں تو جہاں ان کے چہرے پر اپنے بچھڑ جانے والوں کا دُکھ، ان کی آواز کو اضمحلال اور افسردگی پہنا رہا تھا وہیں وہ دلپذیر انداز میں اپنے ''ڈاکٹر بھائی'' کی لمبی زندگی کے لیے دُعائیہ پڑھنے لگتیں۔۔۔

ڈاکٹر مقبول اختر کے چہرے پر ایک عجب وقار، طمانیت اور سکون نظر آ رہا تھا۔ گہرے انبساط میں ڈوبی، ان کی شربتی آنکھیں مسکرا رہی تھیں اور منزّہ کی کتاب کا فسوں تھا کہ ان نثر پاروں پر، ان کو احباب سے یوں داد مِل رہی تھی جیسے کسی اچھے اور منجھے ہوئے شاعر کو کسی مشاعرے کو لوٹ لینے پر ملتی ہے۔

میں نے تب بھی محسوس کیا تھا کہ منزّہ سلیم ناسٹیلجیا کی وہ مریضہ ہیں جو غم کاشت کر کے حضورِ جاں میں ایک باغ تیار کرتی ہیں اور اس باغ میں بھیگی ہوئی خوشیوں کی ایک بادِ نسیم

چلنا شروع ہو جاتی ہے۔ ناسٹیلجیا اگر ایسا ہی ادب جو رُوح کی بالیدگی کا ضامن اور گھرانوں کی یکجائی اور مضمرائی کا صدا کار ہو تو کس کافر کو اس کے ہونے سے مُکرنے کا یارا ہے۔ شرط یہ ہے کہ آپ کے پاس باتیں کرتا ہوا، ادبی اور خوشگوار وجدان ہو جو ایک ہی لمحے میں غم کی کایا پلٹ کر اسے صحت مند ہونے کی سند عطا کرتا ہو۔

منزّہ سلیم نے جب اپنے مرحوم بھائیوں کا تذکرہ کیا تو ساتھ ہی اپنے آخری حیات بھائی ڈاکٹر مقبول اختر کی درازیٔ عمر کی دُعا مانگی تو سب کے دِلوں کی گہرائی سے 'آمین' نکلی۔ اور میں اس غم گرفتہ بہن کے درد اور چاہت کو سمجھتے ہوئے دیر تک کہی جانے والی اجتماعی آمین کی بازگشت کو اپنے وجدان میں گونجتے ہوئے محسوس کرتا رہا۔

ڈاکٹر مقبول اختر کو مرحوم ہوئے ایک سال ہو چکا ہے مگر ان کا مکھن اور چاند میں گندھا چہرہ، میری آنکھوں کو ہمیشہ ایک بڑے پیکر سے بھر دیتا ہے۔ ڈاکٹر صاحب کبھی کبھی، حلقہ اربابِ ذوق میں کسی اہم تہوار پر مضمون پڑھنے کے لیے تشریف لاتے تو بہت تپاک سے ملتے۔۔۔ میں نے یکے بعد دیگرے اپنے دو ناول انھیں پڑھنے کے لیے دے رکھے تھے 'مابین' اور 'دروازۂ گُل' وہ جب بھی ملتے تو ستائشی نظروں سے مجھے دیکھتے، نیمے دروں مسکراتے اور اس مسکرانے میں ان کی آنکھیں ان سے بھی سبقت لے جاتیں۔۔۔

میں کہتا، ڈاکٹر صاحب میرے ناول پر کب مضمون لکھیں گے! ہلکا سا مسکراتے اور کہتے۔

''بس ایک ناول اور لکھ دو، پھر میں لکھوں گا۔''

ڈاکٹر مقبول اختر ایک ماہر نفسیات تھے اور آخری وقت تک پریکٹس کرتے رہے۔ ان کا مطالعہ بہت وسیع اور زرخیز تھا۔ بلا کے مطالعہ کیش اور معنی کش انسان تھے۔ انگریزی ادب پر انھیں بہت عبور حاصل تھا۔ انگریزی ادب میں ناول ان کا پسندیدہ شعبہ تھا۔ ان کے ساتھ مختصر ملاقاتیں ہوتی رہتیں، جن میں ہم ایک دوسرے کے اثباتِ ذات کا بہت خیال

رکھتے۔ دو ایک بار چناب کلب میں، ڈاکٹر صاحب، پروفیسر اشفاق بخاری اور میں یکجا بھی بیٹھے۔ ڈاکٹر صاحب کی ہنس مکھ شخصیت گوہر برساتی رہی۔۔۔ پھر ایک دن خبر آئی کہ ڈاکٹر صاحب کو برین ہیمرج ہوا ہے۔ منزّہ سے فون پر بات ہوئی تو جو جملہ اس کے لبوں سے الگ نہیں ہو رہا تھا، وہ یہ تھا کہ ان کے برین کا Intelect والا حصہ متاثر ہوا ہے۔ بھائی بہت ذہین تھے۔ سارا علم تو ادھر ہی تھا۔ میں نے منزّہ سے نہیں کہا لیکن تب بھی اور اب بھی مجھے ایک بات اندر ہی اندر محسوس ہوتی رہتی ہے کہ ذہین لوگوں کے پاس کل خزینہ صرف دماغ ہی تو ہوتا ہے اور اسے بھی بیماری کا پنجۂ استبداد چھین لیتا ہے تو انسانی شخصیت کا سارا تشخص کھو جاتا ہے۔

تب، جون ایلیا کی ایک تحریر یاد آئی جس میں انھوں نے اپنے بڑے بھائی رئیس امروہوی کے قتل کا ذکر کیا تھا۔ جونؔ نے کہا تھا کہ قاتل بہت ذہین تھا، اس نے تاک کر گولی کا نشانہ بھائی کے سر کا لیا۔۔۔ اور پھر یہ کہ بھائی 'برین' ہی تو تھے۔

ڈاکٹر مقبول اختر، منزّہ سلیم کا چہیتا بھائی۔۔۔ جس نے باپ اور بھائی کی شفقت کو گھلا ملا کر منزّہ سلیم کو پلایا اور اب یہ اپنے بھائی کی یادوں کو جمع کر رہی ہے تو ایک دیوانگی اور شیفتگی ہے جو کہ اس سے بڑے بڑے کام کروانے جا رہی ہے۔ بھائی کی فرمائش پر اپنا ناول ''ادھوری عورت'' مکمل کیا۔۔۔ اور یہ ایک کامیاب ناول ہے۔

اب بھائی کی یادوں کو اکٹھا کرنے چلی ہے تو اسے سوائے ڈاکٹر مقبول کے کسی کا ذکر ہی اچھا نہیں لگتا۔

؎ یا ترا تذکرہ کرے کوئی
یا کوئی مجھ سے بات ہی نہ کرے

وہ ایک بڑے بھائی کی بہن ہے اور ادب، شیرینی اور شیریں سخنی، اس خاندان کا طرۂ امتیاز ہے۔

وہ جو کہتے ہیں دانشور کی موت، زمانے کی موت ہے تو ٹھیک ہی تو ہے۔ ڈاکٹر صاحب چلے گئے، اپنی یادوں اور علمی دستاویزوں کے ساتھ، واقعی پھول لاکھوں برس نہیں رہتے۔۔۔ لیکن پھول اگر اپنے ماحول کو اپنے رگ و ریشہ سے خوشبودار کر دے تو وہ اپنی تخلیق سے وفا کرتا ہے۔ اسی طرح ایک دانشور اپنے علم و ادب سے ماحول کو جگمگاتا ہے تو اَمر ہو جاتا ہے۔ منزّہ سلیم، ڈاکٹر مقبول اختر کی یادوں کو جمع نہیں کر رہی بلکہ اپنی تنہائیوں کی جگمگاہٹ کے لیے ایک نیا ڈاکٹر مقبول اختر تیار کر رہی ہے۔۔۔ اور اس ڈاکٹر مقبول اختر کو ایک زمانہ جانتا ہے۔

OOO

غیر مقبول ادیب ــــ مقبول ڈاکٹر

-عارف حسین عارف-

انسان دنیا سے جاتے ہوئے دو چیزیں چھوڑ کر جاتا ہے، ایک کردار، دوسرا اپنے الفاظ۔ الفاظ جب کردار میں ڈھلنے شروع ہو جائیں تو انسان بنتا ہے جسے فرشتوں سے بہتر کہا گیا ہے۔ یہی انسان جب الفاظ میں ڈھل کر سینہ قرطاس پہ سجنے لگے تو ادب تخلیق ہوتا ہے اور سجانے والا فنکار اور ادیب کہلاتا ہے۔ ایک سچا فنکار اپنے لہو کی آبیاری سے لفظوں کی کھیتیوں کو سینچتا ہے اور معنی کا سونا پیدا کرتا ہے۔ جب وہ سونا بازار میں آتا ہے تو ہر دیکھنے والا پکار اٹھتا ہے کہ یہ تو میرے اندر کی حرارت سے پگھلا ہوا لگتا ہے، مگر یہ تکلیف وہی جانتا ہے جس کا سیروں خون خشک ہوتا ہے تو ایک مصرع تر کی صورت سامنے آتی ہے۔ ادیب کی ذمہ داریاں بہت زیادہ ہوتی ہیں سماج میں رہتے ہوئے سماج کی مکمل تصویر کشی ایک ادیب کا فرضِ عین ہے۔ ایک ادیب اگر صرف اپنے دل کی بات کرے گا تو فن کے ساتھ ناانصافی ہے۔ یہ چند ایک چنیدہ لوگ ہوتے ہیں جن کے پاس یہ صلاحیت ہوتی ہے کہ تمام دنیا پر نہ صرف نظر رکھتے ہیں بلکہ اس دنیا کے تمام مسائل اور ان کے حل بھی اپنے تخیل اور مشاہدے کی مدد سے عوام کے سامنے رکھ دیتے ہیں تاکہ ہر شخص اس آئینے میں اپنی تصویر دیکھ سکے۔ اس

بے ثباتی کے دور میں یہ فریضہ انجام دینا بھی نہایت مشکل ہے مگر چند لوگ ہیں جو بادشاہوں کے خزینوں سے گوہر تلاش کرنے کی بجائے دردِ دل رکھتے ہوئے ادب کی خدمت میں کوشاں ہیں۔ انہی چند گنے چنے لوگوں میں ایک نام ڈاکٹر مقبول اختر کا بھی ہے۔ ان کا نام جب بھی میرے کانوں میں پڑتا ہے ایک عجیب طرزِ رفاقت میری سوچوں میں بجلی کی طرح کوندنے لگتی ہے۔ بے ساختہ یہ شعر میری سماعتوں سے ٹکرا کر میرے ذہن کے طاقچوں پر دستک دینے لگتا ہے:

ے وہ جاتے ہوئے خود کو یہیں چھوڑ گیا ہے
اس کو تو بچھڑنے کا سلیقہ بھی نہ آیا

ڈاکٹر صاحب سے میرا تعارف کوئی اتنا پرانا تو نہیں مگر بعض لوگ ایک آدھ ملاقات میں ہی دل موہ لیتے ہیں۔ ۲۰۰۲ء میں حلقۂ اربابِ ذوق فیصل آباد کے ایک اجلاس میں شرکت کے لیے میں تھری سٹار ہوٹل فیصل آباد میں پہنچا تو ابھی اجلاس شروع نہیں ہوا تھا ۔ چند ایک احباب تشریف فرما تھے۔ سامنے والے صوفے پر ارشد جاوید کے پہلو میں ایک شخص دکھائی پڑا۔ پینٹ شرٹ میں ملبوس، خاصا قد و قامت، گورا رنگ، ماتھا کھلتا ہوا، بغیر ہلائے مسکراتے ہوئے ہونٹ، ٹانگ پر ٹانگ رکھے ایک ہاتھ گود میں اور دوسرے کی کہنی ایک گھٹنے پر ٹکائے ہوئے ہاتھ موڑ کر ٹھوڑی کے نیچے رکھا ہوا، بڑے شیشوں والی بڑی سی عینک کے پیچھے جھانکتی ہوئی باریک بین آنکھیں، میں آگے بڑھا سب کو سلام کیا اور بیٹھ گیا مقصود وفا صاحب نے تعارف کرایا کہ یہ ڈاکٹر مقبول اختر ہیں۔ میں احتراماً اور احتیاطاً چپ سا ہو گیا ۔ ڈاکٹر صاحب نے ہلکی سی مسکراہٹ سے میرے سلام کا جواب دیا۔ میں نے ان کا نام تو بہت سنا تھا مگر یہ پہلی ملاقات تھی جس میں، میں ان کے بارے میں سنی ہوئی ساری باتیں ان کی خموشی سے ہی سمجھ گیا اور ان کی گفتگو سننے کو اور بے قرار ہونے لگا۔ اس اجلاس کی صدارت ڈاکٹر صاحب فرمانے والے تھے۔ کچھ دیر بعد اجلاس شروع ہو گیا۔ ڈاکٹر صاحب

نے ابتدائی جملے ہی ادا کیے تو روایتی بوریت جو حلقہ کے اجلاسوں میں ہوتی ہے ختم ہوگئی۔ ان کی گفتگو کا انداز بھی کمال تھا۔ لفظوں کی پورے مخرج میں ادائیگی اور انداز ایسا کہ لفظ بولتے ہوئے محسوس ہوتے تھے۔ تنقید کے لیے غزل تھی کسی کی۔ ڈاکٹر صاحب نے غزل کے بارے میں جو ابتدائیہ دیا اس میں ہی اتنی جملہ سازی اور معنی خیزی تھی کہ میں تو ان کا معتقد ہوتا چلا گیا۔ پورے اجلاس کو ایسے احسن انداز سے نبھایا کہ کہیں بھی بوریت کا احساس تک نہیں ہونے دیا۔ پروگرام کے بعد ان سے کچھ دیر باتیں ہوئیں۔ لفظوں کو برتنے کا جو سلیقہ ان کے ہاں نظر آیا وہ آج تک میں نے کسی ادیب کے ہاں نہیں دیکھا۔ وہ تحریر میں ہی نہیں گفتگو میں بھی لفظوں سے کھیلتے تھے۔ ایک ایک لفظ کو اتنے معانی میں استعمال کر جاتے تھے کہ سننے والا حیرت میں مبتلا ہو جاتا تھا۔

ان کی تحریر بھی اپنا ثانی نہیں رکھتی۔ ۲۰۰۵ء میں جب میں حلقہ کا جوائنٹ سیکرٹری بنا تو ڈاکٹر صاحب کا ایک انشائیہ قسم کا مضمون ہم نے تنقید کے لیے رکھا۔ مضمون کا عنوان تھا ''چک جھمرے کا بکرا''۔ اس مضمون کی ایک ایک لائن انتہائی قیمتی اور معنی خیز تھی۔ چند لائنیں مجھے یاد ہیں وہ کچھ یوں تھیں:

''جب بھی چک جھمرہ سے ٹرین سیٹی بجاتی ہوئی گزرتی تو بکرے کا خون کھولنے لگتا۔ اس کا دل کرتا کہ اس انجن سے ٹکرا جاؤں جس کی شکل کانے دجال سے ملتی ہے۔۔۔ اسے سب سے زیادہ غصہ رات کے تین بجے گزرنے والی ٹرین پر آتا تھا۔ جس سے سارا گاؤں جاگ جاتا۔ اب یہ وقت نہ تو نماز کا ہوتا تھا اور نہ دوبارہ سونے کا لہٰذا چک جھمرہ کی آبادی تیزی سے بڑھ رہی تھی۔''

ہر چند ڈاکٹر صاحب کی تحریر اور گفتگو دونوں میں اتنی چاشنی ہوتی تھی کہ سننے والا اور پڑھنے والا ان کے سحر میں ایسا مبتلا ہو جاتا کہ خود کو بھی بھول جاتا۔ ایک سال پہلے دو احباب یکے بعد دیگرے ہم سے جدا ہو گئے جن کی موت سے نہ صرف انسانوں بلکہ بہترین

ادیبوں میں بھی کمی آئی ایک نام ڈاکٹر مقبول اختر کا ہے اور دوسرا شہادت سیال کا۔ ڈاکٹر صاحب کی موت کی خبر تو اچانک ملی۔ میرے پاؤں تلے سے زمین نکل گئی چند روز پہلے مل کر آیا تھا۔ وہی مسکراتا ہوا چہرہ۔ لکھنوی سٹائل کی گفتگو جیسے ہر لفظ اپنی ادائیگی اور تلفظ لے کر نہیں بلکہ پورے معانی لیے ان کے منہ سے ادا ہو رہا ہو۔ کافی دیر بیٹھے رہے ڈاکٹر صاحب ادھر ادھر کی باتیں کرتے رہے۔ میں سنتا رہا اٹھنے کو دل نہیں کر رہا تھا مگر وقت کی زنجیریں پاؤں کھینچ رہی تھیں۔ مجھے کہاں خبر تھی کہ ڈاکٹر صاحب سے یہ آخری ملاقات ہوگی۔ ڈاکٹر صاحب کا وہ جملہ مجھے آج بھی یاد آتا ہے ''عارف صاحب بے لوث ہو کر اپنے کام میں لگے رہو دنیا نہیں اللہ صلہ دیتا ہے اور ضرور دیتا ہے۔''

میری یہ دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ ڈاکٹر صاحب کو ان کی نیکیوں کا صلہ دے اور ہمیں ان کے الفاظ سے سیکھنے کی ہمت اور توفیق عطا کرے۔ (امین)

OOO

مقبولِ خاص

(ڈاکٹر مقبول اختر — کچھ یادیں)

— عمیر غنی —

(عمیر غنی، ڈاکٹر بھائی کے بہت عزیز دوست پروفیسر ارشاد احمد خاں کے بیٹے ہیں اور بھائی انہیں پروفیسر صاحب کا 'کلون' کہا کرتے تھے۔ مصنفہ)

میں نے دیکھی زرق برق زندگی، اجلے اجلے دن، مہکی مہکی دھلی ہوئی راتیں اور ان میں ہنستے بستے خوش طبع و خوش پوشاک لوگ جن کے قہقہے ہمارے جیون کا حسن تھے۔ انسانوں کا یہ گروہ، جس میں ڈاکٹر مقبول اختر ایک سرکردہ شخصیت تھے، لائل پور کی ادبی، سیاسی، سماجی اور روزمرہ زندگی کا دل تھا اور ڈاکٹر صاحب اس کی دھڑکن۔

ان کو میں ہمیشہ سے ابّا کے ساتھ دیکھتا آیا تھا۔ از قضا موشے و چغزے باوفا[1] کے مصداق مجھے تو لگتا تھا کہ ڈاکٹر صاحب اور ابّا کا ساتھ لوحِ تحریر کے ساتھ ہی کُن فیکُون ہوا ہوگا۔ کم از کم میں نے تو شاذ ہی دو انسانوں کو عرصہ ہائے دراز زندگی کے ہر معاملے میں

۱۔ از قضا موشے و چغزے باوفا از مثنوی مولانا روم

ترجمہ: (مقدر ٹھہرا کہ چوہے اور پرندے کی آپس میں دوستی ہو جائے)

اس طرح باہم پیوست دیکھا ہے۔ کبھی میرے استفسار پر ابّا نے بتایا بھی تھا کہ محبت کی یہ کہانی میری پیدائش سے پہلے کی تھی۔ مجھے تو لگتا تھا ہے پیدائشِ آدم سے بھی پہلے کی ہوگی۔ بہرحال اس وسیلے سے ڈاکٹر صاحب کا ساتھ میرا بھی مقدر ٹھہرا اور کیا خوش بختی تھی، کیا کمال دولت تھی جو ہاتھ لگی اور تقدیر کو چکا چوند کر گئی۔

بھلے دن تھے یا یوں کہیے کہ بھلے لوگوں کا سایہ سر پہ تھا جن کے دم سے ہر سانس تر و تازہ تھی۔ ڈاکٹر صاحبان (ڈاکٹر مقبول اختر اور ڈاکٹر احسان الحق) اور ابّا کی ملاقات تقریباً روز کا معمول تھی۔ اپنی فیاضی طبع میں میری تجسّس آمیز دخل اندازی کو یہ لوگ یکسر نظر انداز کیا کرتے اور عہدِ حاضر کے حالات پر جامع گفتگو، راشد اور احمد شاملو پر تنقیدی بحث اور سماجی امور کی پرلطف تفسیر میری جھولی میں ''کڑیو بالو چیز و نڈی دی لئی جاؤ'' کے چکر میں پڑ جاتی۔

ڈاکٹر مقبول اختر کی شخصیت کا سحر انگیز فسوں ان محفلوں پر ہمیشہ حاوی رہتا۔ تجربے کی سان پر آزمودہ، پختہ کار نظریات کی بنا پر ان کی گفتگو ہمیشہ ٹھوس اور مدلّل ہوتی۔ اپنے کہے اور لکھے ہوئے لفظ کی حرمت پر ہمالیاتی مضبوطی اور بے نیازی سے قائم رہتے۔ ایک نروانی مسکان ہمیشہ ان کے پرشکوہ چہرے کو سجائے رکھتی اور پرجوش والہانہ قہقہے ان کی روح میں اُمڈتے آسودہ چشموں کے مقدّس پانی سے پورے ماحول کو معطر کرتے نظر آتے۔ قدرت نے ان کے ذمہ دِل آزار انسانوں کی دل جوئی اور راہنمائی کا کام لگایا تھا۔ ڈاکٹر مقبول اختر نے اپنے ہمجولیوں کو آلامِ زیست کے ساتھ حوصلہ سے نبرد آزما ہونے کا فن اپنی آخری سانس تک پوری ایمانداری اور پیشہ ورانہ یکسوئی سے سکھایا۔ لائل پور کے باسیوں کے لیے ڈاکٹر مقبول اختر ایک غنی و غیاث صوفی کی مانند باعثِ رحمت و برکت تھے۔ تقدیر کی چکی میں پسے اور خود ساختہ مصائب کے پِٹے نا آسودہ لوگ ان کے پاس آتے اور بے ساختہ پررونق گفتگو اور چائے کی دو پیالیاں پی کر شادمان، مسرور ڈاکٹر صاحب کو دعائیں دیتے رخصت ہوتے۔ یہ کشفِ کمال تھا۔

ستیانہ روڈ پر واقع سائیکاٹرک کلینک محض گردشِ بخت کے ہاتھوں پریشان حال افراد کی علاج گاہ ہی نہیں تھا بلکہ بہت حد تک ایک ایسا دبستان تھا جہاں نظریات و مشاہدات پر بحث ہوتی اور زندگی کی کثافت سے ماورا ہو کر اس کی لطافت و دلکشی کو اپنانا سکھلایا جاتا۔ حیرت اس بات پر ہوتی کہ یہ راز روزمرہ گفتگو اور لطائف کی بھرمار میں ایک سہل اسلوب سے کھولے جاتے۔

ڈاکٹر صاحب کی آزادیٔ طبع اور اس کے نتیجے میں جنم لینے والے بے باک نظریات کو لائل پور کے نیم پڑھے لکھے اکثر اوقات ملحدانہ قرار دیا کرتے اور اپنے تئیں ان کی زد سے بچا بچا کر رکھتے رہے۔ خود ڈاکٹر صاحب اپنے رفقا کی اس کوتاہ بینی کو چند بے نیاز قہقہوں میں اُڑا دیا کرتے۔ پُرعزم و پرشکوہ ڈاکٹر مقبول اختر شیر سنگھ والا کی پرانی حویلی میں کچھ اور ہی روپ میں دکھائی دیا کرتے۔ زمستاں کی شام کی ہلکی دھوپ میں گرم چادر اوڑھے ایک مدبرانہ سنجیدگی کے ساتھ اپنے اہلِ خانہ کی قبروں کے سرہانے چٹانی سپاٹ چہرے کے ساتھ ایک گھنی چپ لیے کھڑے ہیں۔ نروان تھا یا مکاشفہ کہنا مشکل ہے۔ صاحبِ اسرار تھے اور صاحبِ اسرار ہی رہے۔

آج بھی یہ سب لکھتے اور یاد کرتے یوں لگا کہ چند عشرے پہلے کی رات ذرا گہری ہوئی جاتی ہے۔ ڈاکٹر صاحبان (مقبول اختر اور احسان الحق) کی آمد آمد ہے۔ شطرنج پارٹی ابا کے کمرے سے رخصت ہو رہی ہے اور ابا بے چینی سے کچن میں چکر لگا رہے ہیں۔ اماں اور بہنوں کے ذمہ چائے اور دیگر لوازمات کے انتظام ہیں اور مجھے اور عدنان کو وقتاً فوقتاً مہمان داری ایک تسلسل سے جاری رکھنے کی تاکید خاص ہو رہی ہے۔ سڑک پر کار رکتی ہے۔ ڈاکٹر مقبول اختر کے قہقہوں کی گونج میں دروازے کھلتے اور بند ہوتے ہیں اور اس منظر میں موجود ہر شخص کا چہرہ ایک نقرئی مسکان سے جگمگا جاتا ہے۔

○○○

عملی ریاض

—کیپٹن نثار اکبر خاں—

پڑھنے بیٹھوں تو نظر آتی ہے تصویر تیری
لکھنے بیٹھوں تو فقط ہاتھ تیرا نام لکھے
آنکھ وہ ظرف کہ ہر روز بھرے اور بہے
دل وہ وحشی کہ صبح و شام تجھے یاد کرے

اس شعر کے حوالے سے ڈاکٹر مقبول اختر کی شبیہ مجھے صاف نظر آنے لگتی ہے۔ وہ ایک خوبصورت انسان تھے اور انتہائی پُرکشش شخصیت کے مالک بھی۔ دراز قد، چھریرا بدن، وجیہہ اور حلیم الطبع۔ بہت پڑھے لکھے ہونے کے ناطے انہوں نے جدت پسندی، مساوات اور سوشل تحریکوں کے ذریعے معاشرے کے لیے بہتری کی راہیں تلاش کیں اور انہی کو اپنا شعار بنایا۔

ان کا عملی ریاض یہ تھا کہ انہوں نے قصداً غربا کے علاقوں میں پریکٹس کی اور یوں ان کے دکھ درد اور محرومیوں میں عملاً شرکت کی۔ آپ کی مسیحائی، انسانیت کے بہت کام

آئی۔۔۔اس حد تک جہاں تک ایک اکیلے شخص کی رسائی ممکن ہے۔

انہوں نے تا عمرِ رواں، اپنی مخصوص مسکراہٹ سے ماحول کو خوشگوار بنانے کی سعیٔ مسلسل کی۔ وہ صحیح معنوں میں لوگوں سے ملاقات کا فن جانتے تھے۔ پوری توجہ، مسکراہٹ، خلوصِ نیت اور انتہا درجہ محبت سے ملنے کا فن۔۔۔کاش کوئی ان سے یہ سب سیکھتا۔

معاشرے کی ناہمواریوں کی درستگی کے لیے وہ تمام عمر کوشاں رہے۔ اپنی بیٹی کے میڈیکل کالج میں داخلے کے سلسلے میں ناانصافی کی تلافی کے لیے انہیں ہائی کورٹ تک جانا پڑا اور آخر اس مقصد میں کامیاب ہوئے۔

علمی و ادبی حلقوں کی معروف مصنفہ 'پھول لاکھوں برس نہیں رہتے' اور ناول 'ادھوری عورت' کی خالق، پروفیسر منزہ سلیم کے آئیڈیل بھائی ڈاکٹر مقبول اختر، حقیقی معنوں میں بڑے انسان تھے، جو کم کم پیدا ہوتے ہیں۔

ڈھونڈو گے ہمیں ملکوں ملکوں
ملنے کے نہیں، نایاب ہیں ہم

ان کے لیے دعائے مغفرت کے ساتھ، ان الفاظ پر ختم کرتا ہوں۔

مت سہل ہمیں جانو، پھرتا ہے فلک برسوں
تب خاک کے پردے سے انسان نکلتے ہیں

ooo

ہم سب کے ڈاکٹر مقبول اختر

— محبوب علی شاہ —

میرے لیے ممکن نہیں کہ میں اپنے دوستوں کی صحیح تعداد کا اندازہ بھی لگا سکوں، لیکن میں اپنے تمام غائب اور سلامت جگری دوستوں کی صحیح تعداد ضرور بتا سکتا ہوں۔ شاید اس لیے کہ یہ تعداد ہاتھ کی انگلیوں سے بھی کم ہے۔ جب میں اپنے جگری دوستوں کا موازنہ ایک دوسرے سے کرتا ہوں تو حیران رہ جاتا ہوں کہ ان کی ذاتی اوصاف بالکل ایک جیسے کیوں ہیں؟ حالانکہ پہلی ملاقات میں سنی سنائی باتوں کی بنا پر ان کی ایک آدھ خاصیت کا ہی ہلکا سا علم ہوتا ہے۔ وہ تو بعد میں پتا چلتا ہے کہ یہ بھی باقی گہرے دوستوں کی کاربن کاپی نکلے۔ اپنی دوستی کا بھی عجب حال ہے اور جگری دوستی کا عجب تر۔ جن سے دوستی گہری ہونا ہوتی ہے ان سے ایک، دو یا تین ملاقاتوں میں ہو جاتی ہے۔ باقی تمام عمر دوست رہتے ہیں۔ شاید اس لیے کہ کسی سے بگاڑنا میری سرشت میں نہیں۔ ڈاکٹر مقبول اختر کو میں اپنے جگری دوستوں میں نہایت اعلیٰ درجے پر فائز پاتا ہوں اور اسی قدر احترام کرتا ہوں، صرف اس بنا پر نہیں کہ مرحوم ان تمام اعلیٰ ترین صفات کے حامل تھے جو کسی فرد کو محبوب و محترم بنانے کی ضامن ہیں

بلکہ یہ اس سے بھی پرے کی بات ہے۔

واقعہ یوں ہے کہ عرصہ پہلے فیصل آباد میں ایک بین الاقوامی کرکٹ میچ کھیلا جارہا تھا۔ جس میں امپائرنگ کا فریضہ اس خاکسار کو انجام دینا تھا۔ اس زمانے میں فیصل آباد میں صرف دو جگہیں ایسی تھیں، جہاں باہر سے آئے ہوئے لوگوں کو ٹھہرانے کا انتظام ہوتا تھا۔ ایک ہوٹل گرین اور دوسرا چناب کلب۔ یہ دونوں ٹھکانے، ٹیسٹ میچ کے دوران قطعی ناکافی تھے۔ لہٰذا منتظمین، مہمانوں کی رہائش کا انتظام سرکاری ڈاک بنگلے یا گیسٹ ہاؤس وغیرہ میں کردیا کرتے تھے۔

میں جب فیصل آباد پہنچا تو تمام ٹھکانے پر ہوچکے تھے اور کوئی جگہ دستیاب نہ تھی۔

لیکن میرا مسئلہ ٹھکانے کی عدم دستیابی نہیں تھا، بلکہ ایک سے زیادہ ٹھکانوں میں انتخاب کا تھا، جو میرے لیے کارے دارد تھا۔ بھلا آپ محمد ادریس اور ڈاکٹر مقبول اختر میں سے کس کی پیشکش کو رد کرسکتے ہیں؟ ڈاکٹر مقبول اختر نے مجھے محمد ادریس سے چھین کر کمال کردیا۔

محمد ادریس میرے جگری دوستوں میں سب سے سینئر ہیں۔ ان کے پاس ہر چیز کا جواز ہر وقت موجود رہتا ہے، ایسے شخص سے جیتنا کمال نہیں تو کیا ہے؟

دسمبر میں رات کے تین بجے جب سردی اور نیند کی شدت عروج پر ہو اور آپ کے کمرے کے باہر کوئی پراسرار سرگرمی ہورہی ہو تو صورتِ حال سے آگاہی حاصل کرنے کی جستجو تو ہوتی ہی ہے، خاص طور پر جب جگہ بالکل نئی ہو۔ چنانچہ حسِ تفتیش کے جاگتے ہی باہر جھانکنے کی کوشش کی۔ پردے کے پیچھے ان کھڑکیوں سے جن کے حدود اربعہ کا صحیح اندازہ بھی نہ تھا۔ آخر کار ایک ایسا مقام مل ہی گیا جہاں سے باہر کا کچھ منظر، کم روشنی کے باوجود کافی حد تک صاف تھا۔ کیا دیکھتا ہوں کہ سر سے پیر تک کمبل میں لپٹا، ایک مردانہ سایہ کمرے کی طرف آتا ہے، کچھ لمحے ٹھہرتا ہے اور پرے چلا جاتا ہے۔ خیال آیا کہ ڈاکٹر صاحب کو فوراً اس مشکوک صورتِ حال سے آگاہ کرنا چاہیے۔ مگر کس طرح؟ یہ موبائل فون سے بہت پہلے کی بات

ہے۔ کئی آپشنز پر غور کرنے کے بعد میں نے پراسرار سائے کو خود قابو کرکے ڈاکٹر صاحب کے سامنے پیش کرنے کا فیصلہ کرلیا جو کچھ ایسا مشکل کام نظر نہیں آرہا تھا۔ بھلا جو اوپر سے لے کر نیچے تک دبیز کمبل میں لپٹا ہوا سے قابو میں کرنا کون سا مشکل تھا؟

منصوبہ بندی پر عمل کرنے سے پہلے ہی یہ عقدہ کھل گیا کہ وہ ڈاکٹر مقبول تھے۔ جو گویا ہوئے۔

"معذرت خواہ ہوں کہ آپ کی نیند میں خلل پڑا۔"

"آپ یہاں؟ اس وقت؟"

"گیزر چیک کررہا تھا۔"

"اس وقت؟"

"ہاں تاکہ آپ کو صبح گرم پانی مل سکے۔"

"مگر رات کے تین بجے؟"

"ہاں یہ گیزر پرانا ہوگیا ہے، پانی گرم کرنے میں وقت لیتا ہے۔"

"مگر ڈاکٹر صاحب۔۔۔"

"افسوس کہ نئی ماچس تلاش کرنے میں کچھ گڑبڑ ہوگئی اور آپ کو بے آرام ہونا پڑا۔"

ڈاکٹر صاحب تو یہ کہہ کر چلے گئے لیکن میں دیر تک یہ سوچتا رہا کہ اگر ماچس ختم نہ ہوگئی ہوتی تو ڈاکٹر صاحب کی مہمان نوازی کا یہ پہلو میں کبھی نہ جان پاتا۔

یہ تھے میرے، آپ کے، ہم سب کے ڈاکٹر مقبول اختر، جن کی یاد آج ہم منا رہے ہیں۔

OOO

مرشدِ من ـــ اخترِ من

— محمود ثناء —

فون کی گھنٹی بجی دوسری جانب مقبول اختر تھے کہنے لگے مریض کو آرام آجائے تو ڈاکٹر کے پاس آنا چھوڑ دیتا ہے یا مایوس ہو کر ڈاکٹر تبدیل کر لیتا ہے؟ تم کس حالت میں ہو؟ اور ساتھ ہی عادتاً ہلکا سا قہقہہ۔ میں نے فون بند کیا اور پھر حاضرِ کلینک ہوا۔ عرض گزاری کہ دونوں میں سے کوئی بات نہیں ہے۔ نہ صحت یاب ہوا ہوں نہ مایوس صرف شاعرانہ مزاج کا مسئلہ ہے۔ معاف کیا جائے!

کمالِ خسروانہ سے فرمایا ''مابدولت نے معاف کیا۔''

میں ''محمود ثناء'' صرف شاعر ہوں۔ نثر نگاری یا شخصی خاکہ تحریر کرنا میرا میدان نہیں ہے۔ مگر وہ شخص جسے لوگ ''ڈاکٹر مقبول اختر'' کے نام سے جانتے اور پہچانتے ہیں کی دوستی، محبت ''تو چیزے دیگری'' والا معاملہ ہے۔ یہ کوئی باقاعدہ مضمون نہیں ہے صرف چند یادیں ہیں جن کے ذکر سے ڈاکٹر صاحب کی محبتوں کا قرض تو ہر گز نہیں اتر سکتا مگر پھر بھی۔۔۔

فروری ۱۹۷۲ء مجھے آنتڑیوں میں درد کا مرض لاحق ہو گیا والد مرحوم (گرچہ خود

ہومیو پیتھک معالج تھے) مجھے منٹگمری بازار میں واقع ٹیکہ گلی کی ڈسپنسری میں لے گئے۔ ایک دراز قد، کلین شیو، سرخ و سفید دلفریب مسکراہٹ والے ڈاکٹر نے میرا چیک اپ کیا۔ کچھ ادویات دیں ایک انجکشن لگایا۔ درد غائب، ڈاکٹر اور اس کا انداز بہت اچھا لگا۔

میں نے ۱۹۶۵ء سے جنوری ۱۹۷۲ء تک کا زمانہ عبدالحکیم میں اپنے تایا کے پاس گزارا ہے۔ ۱۹۷۲ء میں لائل پور واپس آیا۔ اقبال نوید کی رفاقت مجھے حلقہ اربابِ ذوق تک لے گئی۔ مختلف ادبی، سیاسی دانشوروں، شاعروں سے ملاقاتیں ہوتی رہیں۔ کئی سال بیت گئے اور میں مختلف مراحل طے کرتا سٹڈی سرکلز سے فیض یاب ہوتا ہوا ''انجہانی مجید جوزف'' کے توسط سے مزدور کسان پارٹی تک جا پہنچا، مجید جوزف نے مجھے دو اصحاب سے خصوصی طور پر ملایا ایک صاحب تو میری طرح کے ہی تھے یعنی ''منظور نیازی'' اور دوسرے صاحب کا نام ڈاکٹر مقبول اختر بتایا گیا فراز کے محبوب جیسی قد و قامت خوش رو، خوش لباس دیو مالائی مسکراہٹ، دماغ نے فوراً گھنٹی بجائی ''میاں یہ تو وہی ڈاکٹر ہے جس نے تمہارا علاج کیا تھا'' میں نے مولانا بھاشانی کے بعد جہاں میجر اسحاق محمد کے ہاتھ پر نظریاتی بیعت کی تھی وہیں مقبول اختر کو بھی مرشد تسلیم کر لیا۔

پارٹی میٹنگ کا یہ تعارف ہر گزرتے دن کے ساتھ نہ صرف نظریاتی بلکہ ذاتی سطح پر ایک مضبوط بندھن میں تبدیل ہوتا گیا۔ دوستی کے بندھن میں، محبت کے بندھن میں، اخلاص کے بندھن میں۔ ڈاکٹر صاحب نے اپنے کسی تعلق کو کبھی سطحی طور پر نہیں رکھا دوستوں کے ہر مسئلہ کو اپنا مسئلہ سمجھنا اور مکمل دل چسپی سے اسے حل کرنے یا کروانے کی کوشش کرتے۔ دوستوں کے کندھے سے کندھا ملا کر کھڑا ہونا اپنا فرض جانتے تھے۔ میں وارث لاء کالج سے منسلک تھا۔ ۲۰۰۳ء میں کالج معاملات کافی گھمبیر صورت اختیار کر گئے تھے۔ رشید مصباح اکثر لاہور رہتا تھا اور تمام مسائل کا سامنا مجھے کرنا پڑ رہا تھا۔ انتہائی ذہنی اذیت کے دن تھے۔ میری بیوی نے اس صورتِ حال کا ڈاکٹر صاحب سے ذکر کیا۔ انھوں نے مجھے بلا کر کہا

''گھر میں داخل ہوتے وقت کالج کی جوتیاں گھر سے باہر اتار دیا کرو جیسے مسجد میں داخل ہوتے وقت جوتیاں اتار دیتے ہیں۔'' ان کی ہر وابستگی پورے اخلاص سے ہوتی تھی دوستوں سے ہو یا گھر والوں سے ''زہرہ'' بھابھی کی وفات کے چند دن بعد میری بیوی ان سے تعزیت کے لیے گئی، باتوں باتوں میں ازدواجی رفاقت کا ذکر چل نکلا کہنے لگے:

''زہرہ اور میری رفاقت ۳۶ سال پر محیط ہے جب اس کی میت گھر لا کر رکھی تو میں باہر صحن میں نکل آیا۔ صحن میں آباد قبروں کو آنکھ بھر کے دیکھا ایک جگہ پہ نظر جا ٹکی دل میں خیال آیا اندر جا کر ''زہرہ'' سے پوچھتا ہوں فلاں جگہ تمہارے لیے مناسب رہے گی۔''

خدا گواہ ان کی وفات کے بعد جب ۱۰ اپریل ۲۰۱۱ کو میری اپنی ازدواجی زندگی کے بھی ۳۶ سال مکمل ہو گئے تو مجھے مقبول اختر اور ان کی یہ بات اس طرح یاد آئی کہ میری دھاڑیں نکل گئیں۔

یکم جنوری ۲۰۰۰ء کو میری پہلی کتاب ''مسافرت'' شائع ہوئی۔ کتاب کی اشاعت پر ''لڈیاں'' ڈالنے والوں میں ڈاکٹر صاحب سب سے آگے تھے۔ وہ اکثر شام کو ڈاکٹر احسان صاحب کی موجودگی میں مجھے بلا بھیجتے اور دراز سے ''مسافرت'' نکال کر نظمیں سنانے کا کہتے۔ انہیں میری نظم ''سنو اک بات کہنی ہے'' بہت پسند تھی۔ میں جن دنوں اپنی طویل نظم ''والعصر'' لکھ رہا تھا اس کے ہر موضوع پر ان سے تبادلہ خیال ہوتا رہا ہے۔ ان کی خواہش تھی کہ میں 'دشتِ سوس' ''حسین بن منصور حلاّج'' کو نظم کروں۔ ڈاکٹر مقبول اختر کو اردو، انگریزی، پنجابی، فارسی اور عربی پر مکمل عبور حاصل تھا۔ میں نے فیض، راشد، بلھے شاہ اور قراۃ العین طائرہ کی شرح انہی سے پڑھی ہے۔ لفظ کی حرمت، اپنے کہے پر پہرہ دینا اور لکھے پر قائم رہنا انہی کا فیض ہے۔ وہ اپنی ذات میں ایک مکمل تربیت گاہ تھے۔ فیصل آباد کی ادبی، سماجی اور پرولتاری ترقی پسند سیاست ڈاکٹر مقبول اختر کے ذکر سے ہی مکمل ہو گی۔

○○○

دوستی ایسا ناتا۔۔۔

-نذیر احمد گل (تایازاد بھائی)-

ڈی۔ای PTCL(R) اسلام آباد

؎ کچھ ایسے بھی اُٹھ جائیں گے اس بزم سے جن کو
تم ڈھونڈنے نکلو گے مگر پا نہ سکو گے

بغیر تمہید باندھے یہ کہوں گا کہ ڈاکٹر مقبول ان معدودے چند لوگوں میں سے تھا جنہیں بہت سے لوگ تاحیات بھلا نہ پائیں گے۔ ان لوگوں میں عزیز واقارب، دوست احباب، ملنے جلنے والے اور مریض سبھی شامل ہیں۔ حتیٰ کہ وہ لوگ بھی شامل ہیں جو ڈاکٹر صاحب سے ایک ہی بار ملے ہوں۔

پیشتر اس کے کہ میں اس کی ہردلعزیز اور مقناطیسی شخصیت کے بارے میں کچھ کہوں میں ڈاکٹر مقبول سے اپنی وابستگی کا ذکر ضروری سمجھتا ہوں۔ ہمارے بیچ متعدد رشتوں کا تانا بانا (جسے پنجابی میں 'گھالا مالا' کہتے ہیں) پشتوں سے چلا آ رہا تھا۔۔۔ اور سب سے بڑھ کر دوستی کا رشتہ تھا۔

ذکر مقبول سے پہلی ملاقات کا۔

یہ بیسویں صدی کے چوتھے عشرے کے اوائل کی بات ہے، ہمارے مشترکہ عزیز کی شادی تھی۔ ہم دولہا اور دلہن دونوں خاندانوں کی طرف سے مدعو تھے۔ ہم لوگ شادی سے ایک دن پیشتر دلہن والوں کے گاؤں پہنچ گئے۔ مقبول لوگوں کا رشتہ دولہا سے زیادہ قریبی تھا اس لیے انہیں بارات کے ساتھ آنا تھا۔ یہ میرے بچپن کا اولین واقعہ ہے جو مجھے آج بھی من وعن یاد ہے۔ اس سے آپ مقبول سے میرے لگاؤ کا بخوبی اندازہ کر سکتے ہیں۔

ہم دیہاتی (پینڈو) لوگ تھے۔ اس زمانے میں دیہاتی رسم و رواج کے مطابق بارات اور دیگر مہمانوں کو 'تکیہ' (جسے آپ شاید چوپال بھی کہہ سکتے ہیں) میں ٹھہراتے تھے۔

'تکیہ' مشرقی پنجاب کے کنڈھی کے علاقے میں اس مخصوص جگہ کو کہتے تھے جو گاؤں کی شاملات میں رفاہِ عامہ کے لیے وقف ہوتی تھی۔ تکیہ میں ایک کچا کوٹھا (کمرہ) ہوتا تھا جس میں خدمت گار رہتا تھا۔ یہاں گھنے درختوں کا جھنڈ ہوتا تھا۔ خدمت گار کے فرائض میں دیگر بیگار کے علاوہ گاؤں والوں کے حقوں کے لیے اپلوں کی آگ مہیا کرنا بھی ہوتا تھا۔ عام دنوں میں کام کے بعد تھکے ہارے کسان، چھاؤں میں چارپائیاں بچھا کر آرام کرتے اور لڑکے تاش وغیرہ کھیلا کرتے۔ شادی بیاہ کے موقعہ پر سارے گاؤں سے چارپائیاں اور بستر جمع کیے جاتے اور چھاؤں میں قطار در قطار مہمانوں کے لیے بچھا دیے جاتے۔ بارات اکثر دو یا دو سے زیادہ دن، دلہن کے گاؤں ٹھہرتی۔

ہاں تو میں کہہ رہا تھا کہ ہم تکیے میں موجود تھے کہ باجے (Brass Band) کی آواز سنائی دی۔ سب لوگ شہر سے آنے والے راستے کی طرف، بارات کے استقبال کے لیے چل پڑے۔ باراتیوں اور مہمانوں کی دودھ اور شربت سے تواضع کی گئی اور پھر عمر رسیدہ مہمان نیم دراز ہو گئے اور ہم بچے کھیل کود میں مصروف ہو گئے۔

دریں اثنا، بارات کے ساتھ آنے والے دو گورے چٹے، اجلے اجلے، نکھرے نکھرے

بچے میری توجہ کا مرکز بنے رہے۔ ان کے لباس کی عمدگی اور سلیقے سے بنائے گئے بال، مجھے بہت اچھے لگے۔ دونوں خاکی نیکر اور سفید قمیص میں ملبوس تھے۔ پاؤں میں انگریزی جوتے (بوٹ) پہن رکھے تھے۔ میرا دل چاہا جھٹ سے دوستی کر لوں اور جلد ہی ہم گھل مل گئے۔ یہ دونوں بھائی تھے۔ رشید اصغر اور مقبول اختر اور یہ تھی ہماری پہلی ملاقات۔ عمر میں مَیں ان دونوں سے بڑا تھا اور دیہاتی ماحول سے زیادہ مانوس، چنانچہ میں نے سیکشن کمانڈر کے فرائض سنبھال لیے اور گاؤں کی گلیوں کی طرف نکل گئے۔ ہم تینوں، باقی مہمانوں سے الگ تھلگ گاؤں کی گلیوں میں گھومتے رہے اور خوب مزا کیا۔ دو دن ہم ساتھ رہے پھر بارات رخصت ہو گئی اور ہم اپنے گاؤں لوٹ گئے۔ اس کے بعد ایک لمبے عرصے تک ہمارا رابطہ منقطع رہا کہ اس زمانے میں مواصلات کے ذرائع محدود تھے۔ ہاں دیگر رشتہ داروں سے کبھی کبھار خیریت کا پتا چلتا رہا۔

۱۹۴۷ء میں پاکستان معرض وجود میں آ گیا۔ میں بڑا ہو گیا تھا۔ سمجھ بوجھ بھی بہتر ہو گئی تھی۔ چھ، سات سال کی عمر میں دو دن کی رفاقت کئی سال گذرنے کے باوجود میرے ذہن سے محو نہ ہوئی تھی بلکہ دل میں دوبارہ ملنے کی تمنا جوان رہی۔ پاکستان کے وجود میں آنے کے بعد بھی پانچ چھ سال تک کوئی قابلِ ذکر ملاقات نہ ہوئی۔

یہ ۵۳-۱۹۵۲ء کی بات ہے کہ میں نے ایمرسن کالج ملتان میں B.Sc میں داخلہ لیا۔ دریں اثنا چچا غلام رسول صاحب (والد ڈاکٹر مقبول) بطور DSP ملتان تعینات ہوئے۔ یہ جان کر میری خوشی کی انتہا نہ رہی۔ میری دلی خواہش پوری ہو گئی۔ ہم ایک دوسرے کے بہت قریب آ گئے۔ ہمارا زیادہ وقت کھیل کود، گپ شپ اور شرارتوں میں گذرنے لگا۔ ہم نے وہ دو سال کا عرصہ بہت enjoy کیا۔

آپ شاید یقین نہ کریں کہ میں نے مقبول کو کبھی Text Books پڑھتے نہیں دیکھا۔ اسے باری تعالیٰ نے غیر معمولی ذہانت عطا فرمائی تھی، اگر میں یہ کہوں کہ وہ genious

تھا تو بیجا نہ ہوگا۔ میں اپنے مشترک دوستوں سے کہا کرتا تھا کہ اگر مقبول کو بہتر وسائل میسر ہوتے تو شاید بہت آگے نکل جاتا (ڈپٹی صاحب کی پولیس میں نوکری کے باوجود وسائل کی کمی سے آپ ان کے گھرانے کی شرافت، ایمان داری اور اعلیٰ اقدار کا بخوبی اندازہ لگا سکتے ہیں) اگر میں یہ کہوں کہ یہی شرافت، دیانت، قناعت، مقبول کو اپنے اجداد سے ورثہ میں ملی تھی تو بیجا نہ ہوگا۔ اسی طرح ذہانت اس کے ننہال کا ورثہ تھی۔ ڈاکٹر صاحب اپنے ماموں میجر اسحاق محمد کے فلسفۂ حیات سے بہت متاثر تھے۔ میجر اسحاق محمد صاحب مزدور کسان پارٹی کے صدر تھے۔ مقبول بھی اس سے وابستہ رہا۔ میجر صاحب کی وفات کے کچھ عرصہ بعد یہ پارٹی شکست وریخت کا شکار ہوگئی۔ مقبول انتہائی صاف گو اور نڈر شخص تھا۔

اب میں جو واقعہ بیان کرنے لگا ہوں، اس میں آپ کو مقبول میں ایثار وقربانی اور منزّہ سے بے پایاں محبت کی ایک جھلک نظر آئے گی۔ ڈپٹی صاحب اوکاڑہ میں تعینات تھے۔ گرمیوں کی چھٹیاں تھیں۔ میں بھی ملنے کے لیے اوکاڑہ گیا ہوا تھا۔ ایک دوپہر ہم نے اوکاڑہ کے نزدیک بڑی نہر (نہر کا نام مجھے یاد نہیں) پر جانے اور نہانے کا پروگرام بنایا۔ منزّہ اس وقت بہت چھوٹی سی تھی۔ میں، رشید، مقبول، صفدر اور منزّہ نہر پر چلے گئے۔ بڑی نہر کے متوازی، ایک چھوٹی نہر (جسے 'مائنر' کہتے ہیں) بہہ رہی تھی۔ میں اچھا تیراک تھا اس لیے بڑی نہر میں نہانے لگا۔ مقبول، منزّہ کو کندھوں پر بٹھائے، مائنر میں نہانے لگا۔ رشید اور صفدر کنارے پر چھاؤں میں بیٹھ گئے۔ تھوڑی ہی دیر کے بعد رشید چیخا۔

''بچاؤ، بچاؤ، مقبول اور منزّہ ڈوب رہے ہیں۔''

میں تیزی سے مائنر کی طرف بھاگا (مائنر اور نہر کے درمیان بمشکل ۲۰ گز کا فاصلہ تھا) میں نے دیکھا کہ مقبول اور منزّہ غوطے کھا رہے ہیں۔ میں نے مائنر میں چھلانگ لگائی اور مقبول اور منزّہ کو اٹھا کر کھڑا کر دیا۔ یقین کریں پانی بمشکل مقبول کی کمر تک گہرا تھا لیکن جب بہن اس کے کندھوں سے پھسل کر پانی میں گر گئی تو اسے غوطے کھاتے دیکھ کر مقبول حواس کھو

بیٹھا اور منزّہ کو بچانے کے دوران خود بھی غوطے کھانے لگا۔ کیا یہ بہن کے لیے مقبول کا محبت اور ایثار کا جذبہ نہیں تھا؟

ہر انسان رشتوں کے تانے بانے میں محبتوں نفرتوں اور رقابتوں میں الجھ کر رہ جاتا ہے لیکن آفرین ہے مقبول پر کہ اس نے تمام رشتوں کو بڑے احسن طریقے سے نبھایا۔ شریکِ حیات سے گہری وابستگی کے باوجود بہنوں اور بھائیوں کی محبت میں ذرہ برابر فرق نہ آنے دیا۔ ماں جائیوں سے بے پناہ محبت کو اولاد سے گہری محبت کی راہ میں رکاوٹ نہ بننے دیا۔ ساری زندگی رشتوں کو اس طرح نبھایا کہ تمام تر مصروفیتوں کے باوجود دوستوں حتیٰ کہ دور پار کے رشتہ داروں کی غمی خوشی میں برابر کا شریک رہا۔

والدین کی شفقت ہو یا اولاد کی فرماں برداری، بہن بھائیوں کی محبت ہو یا ایثار و قربانی، علم و دانش ہو یا قناعت پسندی، ڈپٹی صاحب کا گھرانہ تمام رشتہ داروں میں منفرد مقام رکھتا تھا۔ تمام رشتہ دار، دوست احباب اس گھرانے کو اپنا ideal گھرانہ سمجھتے تھے اور پھر نہ جانے، خوشیوں سے اس ہنستے بستے گھر کو کس کی نظر لگ گئی۔ یکا یک مقبول پر غم والم کے پہاڑ ٹوٹ پڑے۔ قدرت کی ستم ظریفی دیکھیے کہ یکے بعد دیگرے ایک سے بڑھ کر ایک صدمہ مقبول کا مقدر بن گیا۔

سب سے پہلے، خوش وخرم چھوٹا بھائی چشم زدن میں مقبول کی آنکھوں کے سامنے اللہ کو پیارا ہو گیا۔ دس ماہ کے بعد اس کے والد صاحب جو اس کے لیے مشعل راہ تھے، اچانک داغِ مفارقت دے گئے۔ دو سال کے بعد بڑا بھائی رات کو ٹھیک ٹھاک سویا اور صبح پتا چلا کہ وہ سارا بوجھ مقبول کے کندھوں پر ڈال کے ابدی نیند سو گیا ہے۔ یہ سب صدمے دیکھنے کے چھ ماہ بعد، جان سے پیاری ماں بھی چل بسیں۔ بہت ہی قلیل عرصہ میں والدین اور بھائی چلے گئے اور مقبول کو دکھوں کے پہاڑ سے نبرد آزمائی کے لیے اکیلا چھوڑ گئے۔ دعاؤں اور شفقت کا سایہ بھی چھن گیا۔

آفرین ہے مقبول کی ہمت، حوصلے اور برداشت پر۔ تمام تر دکھوں اور آزمائشوں کے باوجود، مقبول نے سارے دکھ درد اپنے سینے میں سمو لیے اور ایک نئے عزم کے ساتھ، ڈپٹی صاحب کے باقی ماندہ خاندان کے ہر فرد کے تحفظ اور رہنمائی کا تنِ تنہا بیڑا اٹھایا۔

مقبول ابھی پچھلے صدموں سے سنبھل بھی نہیں پایا تھا کہ شریکِ حیات بھی داغِ مفارقت دے گئی۔ باری تعالیٰ نے 'ابھی عشق کے امتحان اور بھی ہیں' کے مصداق، آخری اور کڑا امتحان باقی رکھ چھوڑا تھا جو موذی مرض کی صورت میں وارد ہوا۔ واہ میرے یار تو نے پھر بھی ہتھیار نہیں ڈالے۔ چھوٹی بہن اور بڑی بیٹی کی رفاقت میں اس مرض کا ڈٹ کر مقابلہ کیا اور پھر تمام ذمہ داریاں منزّہ کو سونپ کر آخری ہچکی لی اور غموں سے آزاد ہو گیا۔

آخر میں مَیں مقبول کی حکمت و دانش، علم و فضل اور عزم و ہمت کی صلاحیت کو انگریزی کے ایک فقرے میں دادِ تحسین پیش کروں گا۔

"He was the man, who managed relations, friends and affairs very well."

OOO

۔ نوشین حیدر ۔

؎ قفس اداس ہے یارو صبا سے کچھ تو کہو
کہیں تو بہرِ خدا آج ذکرِ یار چلے

''تم لکھا کرو''

''سر، مجھے نہیں لگتا کہ میں اتنی Creative ہوں کہ کچھ لکھ پاؤں۔''

''اس شہر میں تم سے زیادہ Creative اور کوئی نہیں۔''

وہ مدبّر اور دانا شخص میری عزتِ نفس کی بحالی کے لیے انتہائی پرخلوص مشورہ دے رہے تھے۔

اور آج جب زندگی میں پہلی مرتبہ لکھنے بیٹھی ہوں تو اس افسوس کے ساتھ کہ وہ مشورہ جو ڈاکٹر صاحب نے اپنی زندگی میں دیا تھا اس پر عمل، ان کے جانے کے بعد کر رہی ہوں۔

میرا قلم، میرا ساتھ نہیں دے رہا اور سوچ رہی ہوں کہ مجھے زندگی گزارنے کا سلیقہ سکھانے والے اب اس ناپائیدار دنیا میں نہیں ہیں۔

ڈاکٹر مقبول میرے Mentor تھے۔ اپنے بچوں یا اپنی زندگی سے متعلق کوئی

مسئلہ ہو، ڈاکٹر صاحب انتہائی توجہ سے سنتے اور چند دن غور کرنے کے بعد اس پر فیصلہ دیتے۔
میرا M.Phil کرنے کا فیصلہ بھی انہوں نے دیا اور پھر اس کھردری، خود پسند اور فانی دنیا
سے مجھے اکیلے لڑنے کے لیے چھوڑ کر، خود کہیں دور، بغیر کوئی ٹھکانہ بتائے چلے گئے۔

بظاہر Leftist نظر آنے والے، خدا اور اس کے رسول کی تعلیمات پر بہت سے
نام نہاد، مذہبی پیشواؤں سے زیادہ عمل کرتے تھے۔ سادگی، توازن اور خلوص کا مرقع ایک بڑا
آدمی، جس نے کسی کی لاش پر پاؤں رکھ کر، اپنے قد کو کبھی اونچا نہیں کیا۔

اس شہر کے واحد ڈاکٹر جو کہ فیس لینے کی بجائے اپنے مریضوں کی تواضع کرتے۔
جن کے سینے میں Calculator کی جگہ دل تھا۔

ایک روز کہنے لگے۔

''مٹھیاں بنانی اب کسی کو بھی نہیں آتیں۔ پرانی بیبیاں کونڈوں کی نیاز اور شادی
بیاہ پر بنایا کرتی تھیں۔''

میں نے کسی 'پرانی بیبی' سے recipe پوچھی، بنا کر رکھیں تو پتا چلا کہ وہ ہسپتال
میں ہیں۔ ان کی بیٹی زرقا کے گھر گئی تو آرام فرما رہے تھے۔ میں انتظار کرتی رہی مگر۔۔۔ یہ
وہ ڈاکٹر مقبول نہیں تھے۔ الفاظ کو comprehend کرنے سے قاصر۔۔۔ آنکھوں میں
اجنبیت۔۔۔ میرا دل ناتواں برداشت نہ کر پایا اور نہ ہی دوبارہ جانے کی ہمت ہوئی مگر دل
کے کہیں قریب سے آواز آئی۔

''ہم ڈاکٹر مقبول صاحب کو کھو چکے ہیں۔''

میرے جیسے کم مایہ لوگ، ان کی شخصیت پر کیا روشنی ڈال سکتے ہیں۔ انہیں ایک
اچھا انسان، اچھا ڈاکٹر اور انٹلکچوئل کہہ کر ہم اپنی ذمہ داری سے سبکدوش نہیں ہو سکتے۔ جتنا
خلوص، جتنا وقت انہوں نے مجھے دیا۔ میں یہ چند بے ربط حروف لکھ کر یقیناً اس کا رتی بھر بھی
بدلہ نہ چکا سکوں گی۔

ایک Feminist ہونے کے ناطے، مجھے ان کی سب سے زیادہ بھلی بات یہ لگتی
تھی کہ ان کے دل میں عورت کی عزت تھی۔ اپنی بیٹیوں کے بارے میں بات کرتے ہوئے،
ان کی آنکھوں میں چمکتے جگنو، میں نے کسی باپ کی آنکھوں میں آج تک نہیں دیکھے۔ اپنی
مرحومہ بیوی کا Extrovert ہونا ان کے لیے انتہائی قابلِ فخر تھا۔

مجھے اکثر محبت سے ڈانٹتے ہوئے کہتے:

''تم دوسری منزہ ہو۔ وہ بھی بہت Nostalgic ہے۔ کبھی بھی اپنے میکے کی یاد
سے باہر نہیں آ سکتی۔''

Sir، آج آپ نہیں ہیں لیکن میرے جیسی Nostalgic اس حقیقت کو کبھی قبول
نہیں کر پائے گی۔ جب کبھی کسی سوال کا جواب چاہیے ہوگا تو آپ کی بتائی ہوئی wisdom
سے اس کا جواب ڈھونڈنے کی اپنی سی کوشش کروں گی اور مجھے مایوسی نہیں ہوگی۔ آپ ایک
عطیۂ خداوندی ہیں۔ میں کبھی 'تھے' نہیں کہہ پاؤں گی کہ بخدا آپ اپنے پیاروں کے دلوں
میں زندہ جاوید رہیں گے۔

؎ یاد رفتگاں کی بھی ہمت نہیں رہی
یاروں نے کتنی دور بسائی ہیں بستیاں

○○○

ڈاکٹر مقبول صاحب

—نویدہ کوثر—

میں ان ڈاکٹر مقبول صاحب کی بات کر رہی ہوں کہ جن کے کلینک پر جاتے ہوئے چاہے موڈ پر اُداسی کے گہرے سائے ہوں مگر باہر نکلو تو مسکراتے ہی جانے کو جی چاہے۔

جب میری ان سے ملاقات ہوتی تو وہ اپنے دونوں تالی بجانے کے انداز میں جوڑتے اور کہتے:

''بی بی رانی، لائل پور کی دیوانی، خدا کے لیے خود کو ضائع نہ کرو کہ چار، پانچ لوگوں کے برابر علم و دماغ ہے تمہارے پاس قلم اُٹھاؤ اور شروع ہو جاؤ۔''

نہ کوئی غرض، نہ کوئی طلب، پھر بھی روشنی ہی روشنی، ایسا بھی ہوا کرتا ہے کوئی؟ نہ ہوا اور کوئی، ڈاکٹر مقبول صاحب تو بس ایسے ہی تھے۔

؎ عجیب رنگِ صداقت تھا اس کے چہرے پر
گلوں سے اٹھتی صبا شمیم لگتی تھی

دلی سکون میسر تھا اس کی قربت میں
ہر اک ادا اس کی بہت کریم لگتی تھی

تیری ہر اک عنایت پہ رشک آتا ہے
ذات تیری ہر وصف سے کیسی عظیم لگتی تھی

میں سابقہ لائل پور اور حالیہ فیصل آباد کی سحر انگیزی کی اسیران سے بحث کرتی۔

''کیا ہوا جو بخاری صاحب نے کتاب لکھ ماری اور آپ نے اور ڈاکٹر احسان صاحب نے ان کی مدد کر دی۔ اس کا یہ مطلب تو ہرگز نہیں ہے کہ بخاری صاحب اس شہر کے مجھ سے بڑے عاشق ہیں۔''

وہ کھل کر ہنستے اور کہتے

''بالکل درست، ایسا ہی ہے، ہور دس، ہور کی اعترافِ جرم کرنا اے۔''

میں اور بشریٰ علم الدین دونوں ان کے ساتھ مل کر ہنس دیتیں۔ ایسا عالی ظرف دوسرا کہاں ملے گا جو صرف ایک مسکراہٹ کی خاطر، اپنے کارنامے سے انکاری ہو جائے۔

اس بے رحم دنیا میں کاش ربّ نے دو چار اور ڈاکٹر مقبول بنائے ہوتے تو دنیا کا یہ حال نہ ہوتا کہ:

؎ ڈھونڈتے ہیں راستہ اک دوسرے کو روند کر
اے خدا کیا اس زمیں کی وسعتیں جاتی رہیں

خدا نے ہمارے پاس Choice نہیں رکھی۔ ورنہ ڈاکٹر مقبول صاحب کی جگہ، مجھ جیسے چلے جائیں تو کام چل سکتا ہے لیکن اب ان کئی سو لوگوں کا کیا بنے گا جو ان سے جینے کا ہنر سیکھتے تھے۔

؎ مسافتوں نے تھکا دیا ہے سو رو پڑی ہوں
کسی نے دل کو دکھا دیا ہے سو رو پڑی ہوں

ے تاریک راہوں میں جس کی خاطر دیا جلایا

اسی نے اس کو بجھا دیا ہے سو رو پڑی ہوں

یہ مشیت ایزدی ہے ورنہ وہ ضرور منزہ، نویدہ اور ہم جیسے بے شمار لوگوں کے بہتے آنسوؤں کو ضرور مدنظر رکھتے کہ ڈاکٹر مقبول صاحب کی چھاؤں ہمارا وہ قیمتی اثاثہ ہے جوان کے جانے سے، ہم سے چھن گیا۔

000

رپورٹ جلسہ مزدور کسان پارٹی

-نور خان-

عظیم دانشور، ادیب، ڈرامہ نگار، قانون دان اور پاکستان مزدور کسان پارٹی کے بانی صدر میجر اسحاق محمد کی چھبیسویں برسی بڑے ہی جوش و خروش عقیدت و احترام کے ساتھ ۶۴۴ گ ب اسحاق نگر تحصیل جڑانوالہ ضلع فیصل آباد میں منعقد ہوئی۔

جو اس لحاظ سے خصوصی اہمیت کی حامل تھی کہ دو حصوں میں تقسیم ہونے کے سات سال بعد پہلی مرتبہ کمیونسٹ مزدور کسان پارٹی اور مزدور کسان پارٹی نے مشترکہ طور پر منعقد کر کے بدخواہوں کو انگشت بدنداں کر دیا۔ جو اتحاد و اشتراک کی طرف پہلا قدم ثابت ہوگا۔ اتنے خوشگوار ماحول میں کبھی کامریڈ غلام نبی کلو کی قیادت میں منعقد ہونے والے اجتماعات کی یاد تازہ کر دی۔

اسٹیج کا ماحول بھی اتنا منظم اور منفرد تھا کہ طبقاتی شعور و یگانگت کا مظہر تھا۔ جس کا انتظام دونوں پارٹیوں کی ایک چار رکنی کمیٹی جو محفوظ خان شجاعت، کامریڈ ضیاء الحق، چوہدری ارشاد اور کامریڈ حبیب پر مشتمل تھی نے کیا تھا جبکہ صدارت ڈاکٹر مقبول اختر کے حصہ میں آئی

تھی اور سٹیج سیکرٹری کے فرائض بہت ہی عمدگی سے نئے جوش ولولے کے ساتھ لیکن سادگی سے محمد بابر نے نبھائے۔

پریزائڈنگ کمیٹی نے طے شدہ اصول کے مطابق ڈاکٹر مقبول اختر کا نام افتتاحی خطاب کے لیے پکارا جنہوں نے صدارتی پینل کی طرف سے شرکا کو جی آیاں نوں کہا اور اعلان کیا کہ آئندہ کامریڈ میجر اسحاق کی برسی ۲ر اپریل، ۶۴۴ گ ب پر کوئی سمجھوتہ نہیں ہوگا ہر قیمت پر ہر سال بلاتعطل منعقد ہوگی اور کوئی مقرر سٹیج پر آکر اختلافی بات نہیں کرے گا، اشاروں کنایوں سے بھی کسی کی تضحیک و توہین کے پہلو کا اظہار نہیں کرے گا، صرف اور صرف حکمران طبقات، اشرافیہ، سامراج، جاگیرداری، سرمایہ داری اور عوام دشمن طبقات کے خلاف اور میجر اسحاق کی سیاست اور جدوجہد پر اظہار خیال کیا جا سکے گا۔ خلاف ورزی کرنے والے اور متعین اصول توڑنے والے مقرر کو تقریر سے روک دیا جائے گا اور کسی مقرر کو منفی گفتگو کی اجازت نہیں ہوگی۔

ڈاکٹر مقبول اختر نے کہا کہ انقلاب فرانس سے قبل ایک فیصد لوگ حکمران تھے جاگیرداری نے حکمرانوں کی تعداد میں اضافہ کیا بھوکوں کی تعداد کم ہوگئی لیکن بھوک بڑھ گئی۔ سرمایہ دارانہ جمہوریت نے محکوموں کی تعداد مزید کم کی اور حکمرانوں کی تعداد میں اضافہ کیا۔ بے شک بھوک مزید بڑھ گئی اس لیے میجر اسحاق محمد کی فکر کو مزید آگے بڑھانے کے لیے تسلسل سے جدوجہد کو آگے بڑھائیں ۶۴۴ گ ب میں ۲ اپریل کا سالانہ اجتماع بہت ہی موثر اور بے مثال عمل ہے۔

منافرت اور منافقت ذاتی عناد اجلاس سے باہر ایسے چھوڑ آیا کریں جیسے نمازی مسجد سے باہر جوتے اتار آتے ہیں۔

محفوظ خان شجاعت نے مزید کہا کہ جب افضل بنگش، شیر علی باچہ اور امتیاز عالم پارٹی کو داغ مفارقت دے گئے اور میجر اسحاق محمد ملتان میں پریس کانفرنس سے خطاب کر رہے

تھے تو نوائے وقت کے صحافی نے پارٹی کو چار ٹکڑوں میں تقسیم کرنے والے صاحبان کے خلاف شعلہ بیانی کرانے کے لیے سوال کیا کہ آپ کے پرانے اور صف اول کے لیڈران کرام پارٹی میں کب واپس آرہے ہیں تو جواب میں میجر اسحاق محمد نے صحافی کی توقعات کے برعکس فرمایا کہ جب عدّت کی مدت پوری ہوگی تب ہم ایک ہو جائیں گے۔ ہم نے دیکھا کہ فرانس میں ایک بہت بڑی تعزیتی تقریب منعقد ہوئی جس میں میجر اسحاق محمد کی وفات کے صدمے سے سرشار سب مقررین سے زیادہ نڈھال افضل بنگش نے عقیدت کے اظہار کے وہ گوشے وا کیے کہ عقل دنگ رہ گئی جو میجر اسحاق محمد کی موت کا صدمہ برداشت نہ کر سکے اور بہت جلد دنیا فانی سے رحلت فرما گئے۔

ظہور مانسہروی نے اپنے خطاب میں کہا کہ کامریڈ میجر اسحاق کی جدوجہد کو تسلسل کے ساتھ خراج عقیدت پیش کرنا قابلِ ستائش عمل ہے۔ آج جسمانی طور پر بے شک میجر اسحاق موجود نہیں لیکن ان کی فکر پر عمل کرتے ہوئے اس مشعل کو نئی نسل تک پہنچائیں گے۔ آج موقع ہے کہ درست فیصلہ کریں کہ استحصالی قوتیں متحد ہو رہی ہیں اور ہم متحد نہیں ہیں۔ میں امید کرتا ہوں کہ تاریخ کے تقاضوں کو پورا کریں گے۔ انہوں نے امام علی نازش کی جدوجہد کو بھی مشعل راہ قرار دیا۔

سی ایم لطیف ایڈووکیٹ نے خطاب کرتے ہوئے کہا کہ تنظیمیں فیل ہو چکی ہیں کیونکہ تنظیمیں معاملات میں الجھی ہوئی ہیں اور عوام بہت آگے جا چکے ہیں۔ خدارا میجر اسحاق کے راستے پر چلتے ہوئے آگے بڑھو اور قیادت فراہم کرو۔ تحریک آگے چلی گئی ہے اور ہم پیچھے رہ گئے ہیں۔ اب جمہوریت سے کام نہیں چلے گا عوام کو اقتدار دینا ہوگا۔

ممتاز علی ایڈووکیٹ نے خطاب کرتے ہوئے کہا کہ کارکن کو اپنی انا کو قائم رکھنا چاہیے۔ گروہ بندی، گٹھ بندی اور فروعی اختلافات کا شکار ہونے کی بجائے نظریاتی شعور میں اضافہ کرنا چاہیے، مطالعہ پر توجہ دینی چاہیے، ظالم اور مظلوم کا فرق واضح کرنا چاہیے۔

عبدالستار گنہگار نے بلھے شاہ کے کلام سے آغاز کرتے ہوئے کہا کہ ''بلھے شاہ اساں مرناں ناہیں گور پیا کوئی ہور'' تو آج میجر اسحاق اپنی فکر و عمل اور جدو جہد کے ناطے زندہ و جاوید ہیں۔

انوارالبشیر ہنگی آف کاغان نے کہا کہ میجر اسحاق کا خلوص، اخوت، محبت، بھائی چارہ اور انتھک عملی جدو جہد سب یادگار ہیں اور ان کی تمام تصانیف فکر انگیز ہیں لیکن ڈرامہ مصلی اپنی مثال آپ ہے۔ ہر مرتبہ مطالعے سے ذہن کے نئے دریچے کھلتے ہیں اور نئے گوشے واہ ہوتے ہیں۔

عوامی شاعر طالب حسین بٹالوی نے اپنے کلام ''وقت کی دہلیز پر سہمی کھڑی ہے زندگی'' پیش کر کے داد و تحسین وصول کی۔

مزدور رہنما عرفان علی (لاہور) نے کہا کہ جس دنیا کے لیے حسن ناصر، نذیر عباسی، ہو چی منہ اور چی گویرا نے قربانی دی یہی سوشلزم ہے اسے قائم کرنے کے لیے سائنٹیفک جدو جہد کرنی ہوگی اور جنرل شاہی کے خلاف سوچ پیدا کرنا ہوگی، کھیت اور کھلیان میں جدو جہد کر کے میجر اسحاق کی طرح شعور اجاگر کرنا ہوگا۔

کامریڈ رمضان میمن (کراچی) نے اپنے خطاب میں کہا کہ میجر اسحاق کی تصنیف ڈرامہ مصلی کے ٹائٹل پر نہ مارکس، نہ لینن اور نہ سٹالن کا نام لکھا ہے لیکن پورا متن (Script) مارکسی نظریات و افکار کا عکاس ہے جو پڑھنے والے کو ذہنی آسودگی اور نظریاتی رہنمائی فراہم کرنے میں اپنا ثانی آپ ہے۔ آج میجر اسحاق کے نظریات اور عملی جدو جہد یہی ہے۔

تقاریر کے اختتام پر پریزائڈنگ کمیٹی کے ممبران محفوظ خان شجاعت، ضیاء الحق، چوہدری ارشاد، کامریڈ حبیب اور صدر تقریب ڈاکٹر مقبول اختر نے کھڑے ہو کر برسی کی تقریب کے اختتام کا اعلان کیا۔

○○○

محترم ڈاکٹر مقبول اختر کی نذر

—احمد شہباز خاور—

حسین، ہنس مکھ، کِھلا کِھلا
خوش مزاج چہرہ
کہ جس کی ضو سے
رہِ صفِ دوستاں منوّر رہی ہمیشہ
کہ جس کے لحنِ سحر اثر سے
جو پھول جھڑتے وہ بے خزاں تھے
ستارہ و ماہ و کہکشاں تھے
وہ زیبِ گلشن
ہر ایک گل کا جو بانکپن تھا

وقارِ تقدیسِ حرف و معنی تھا

جانِ فن تھا

وہ گلعذار اپنی ذات میں ایک انجمن تھا

وہ امن کا آشتی کا مظہر

کہ جس کی سوچوں میں

آدمیت سے پیار

اخلاص کے ہزاروں چراغ روشن تھے

جا چکا ہے

اگرچہ دوری اٹل حقیقت ہے

پھر بھی یونہی کبھی کبھی یہ گماں ہوا ہے

کہ جانے والا

گیا نہیں ہے

ہماری آنکھوں میں جھانکتا ہے

ہماری روحوں میں بس رہا ہے

یہیں کہیں ہے

○○○

طلوعِ صبحِ مفارقت

— محمود ثنا —

تو یوں ہوا پھر

اُداس لمحوں نے سب کی آنکھوں کو یرغمالی بنا لیا تھا

دُھند تھی کہ ہر ایک رستے کو اپنا بندی بنا رہی تھی

اِک قیامت تھی

دھیرے دھیرے اتر رہی تھی

تمام احباب مضطرب تھے

یہ کیا ہوا ہے؟

یہ زندگی موڑ مڑ گئی کیا؟

وہ پھول چہرہ کہ جس کی ڈوری سے سب بندھے تھے

بکھر گیا ہے

وہ چاہتوں کا چراغ جس سے

رفاقتوں کے تمام رستے ہوئے منوّر

وہ بجھ گیا ہے

کہ ہجرتوں کے گلاب پہنے

وہ موسموں کا سفیر میرا

نئے جزیروں کو چل دیا ہے

تمام احباب آنکھیں دریا کیے کھڑے ہیں

یہ کیا ہوا ہے؟

کہ فرشِ دل پر جدائیاں خیمہ زن ہوئی ہیں

ہر ایک منظر ہوا ہے پتھر

کہ میری صبح کا چہرہ ایسے ہوا ہے زخمی

کوئی بھی مرہم نہیں ہے شافی۔۔۔

راہ چلتے ہوئے اچانک

یہ زندگی موڑ مڑ گئی ہے

وہ دیکھو قبروں کے درمیاں جو،

روشنی کا حصار سا ہے

طلوعِ صبحِ مفارقت کا نشان ہے وہ

OOO

ڈاکٹر مقبول اختر کی نذر

—ڈاکٹر یونس ایاز—

فروغِ عظمتِ انسانیت تھا

وہ دھرتی پر کمالِ بندگی تھا

ہمیں غم آشنائی دے گیا ہے

وصالت میں جدائی دے گیا ہے

فشارِ ضبط کی تیرہ شبی میں

سدا جینے پر اُکساتا تھا ہم کو

ہمیشہ فرقتوں کی سرد رت میں

وہ سورج بن کے گرماتا تھا ہم کو

اسے اے کاش یہ احساس ہوتا
بچھڑ کر اس سے ہم اہلِ تمنا

رہین وقفِ غم خواری رہیں گے
شکارِ گریہ و زاری رہیں گے

حیاتِ معتبر میں ہم نے دیکھا
کوئی پیغمبری کردار تھا وہ

وہ ڈھارس تھا ہم ایسے دل جلوں کی
محبت کا بلند مینار تھا وہ

کمی اس کی قیامت تک رہے گی
ہمیں یہ زہر پینا ہی پڑے گا

ooo

ہجراوروصال کے پھول

ہجر کی رات اور وصال کے پھول
آج پھر درد وغم کے دھاگے ہیں
ہم پرو کر ترے خیال کے پھول

تیری دہلیز پر سجا آئے
پھر تری یاد پر چڑھا آئے

باندھ کر آرزو کے پلے میں
ہجر کی راکھ اور وصال کے پھول

(فیضؔ)